ماہ جولائی ۵۶ء

رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۳۴۰

ذی العقدہ ۱۳۷۵ ھ

جلد ۴۶ عدد ۵

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵- اے ذیلدار پارک، اچھرہ ــ لاہور پاکستان

چندہ سالانہ چھ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

خالی صفحه

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۴۶ | ذی القعدہ ۱۳۷۵ھ مطابق جولائی ۱۹۵۶ء | عدد ۵

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ۔ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

پچھلی اشاعت میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ معاشرے کی اصلاح اور اسلامی نظامِ زندگی کی تعمیر کا جو کام لب در پیش ہے اس کے لیے کن صفات کے حامل افراد درکار ہیں اور اُن افراد کی اجتماعی تنظیم میں کن اوصاف کا پایا جانا ضروری ہے۔

اس سلسلے میں اب تک جن امور کا ذکر کیا گیا ہے ان کی حیثیت دراصل محض ابتدائی اور بنیادی اوصاف کی ہے۔ جس طرح ایک کاروبار کی ابتدا کرنے کے لیے ایک کم سے کم سرمایہ درکار ہوتا ہے جس کے بغیر اسے شروع ہی نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح اِس کام کے لیے یہ کم سے کم اخلاقی سرمایہ ہے جو آغاز کار ہی میں موجود ہونا چاہیے، ورنہ اس کا حوصلہ کرنا ہی فضول ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے افراد کے ہاتھوں کسی اسلامی نظام کے قیام کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا جو اسلام کو جانتے ہی نہ ہوں، یا اس کے بارے میں خود اپنے اندر ہی قلبی اطمینان اور ذہنی یکسوئی نہ رکھتے ہوں، یا اس کو خود اپنے اخلاق و کردار اور اپنی عملی زندگی کا دین بنانے سے قاصر ہوں، یا اس کے قیام کی سعی کو انہوں نے اپنا مقصود ہی نہ ٹھیرایا ہو۔ اسی طرح یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر مطلوبہ اوصاف کے افراد جمع تو ہو جائیں مگر ان کے دل باہم جڑے ہوئے نہ ہوں، ان میں تعاون اور نظم و ضبط نہ ہو، اُن کو مل کر کام کرنے کا ڈھنگ نہ آتا ہو، اور وہ باہمی مشورہ و تنقید کے صحیح طریقوں سے نابلد ہوں، تو محض ان کا جمع ہو جانا کوئی مفید نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا۔ لہٰذا یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ وہ چار انفرادی اور چار اجتماعی اوصاف، جن کا ذکر ہم نے اب تک کیا ہے، درحقیقت اس کام کا سرمایۂ آغاز ہیں اور ان کی جو کچھ بھی اہمیت ہے اسی لحاظ سے ہے۔ لیکن یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ اس کام کے فروغ اور اس کی کامیابی کے لیے بس یہی اخلاقی و روحانی سرمایہ کافی ہے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ وہ مزید اوصاف کونسے ہیں جو اصلاح و تعمیر کے مقصد میں کامیاب ہونے

کے لیے ضروری ہیں۔

ان میں سے اولین وصف تعلق باللہ و اخلاص للہ ہے۔ دنیا کے دوسرے سب کام تو نفس یا خاندان یا قبیلے یا قوم و وطن کی خاطر کیے جا سکتے ہیں، ذاتی اغراض اور مادّی مقاصد کی ساری آلائشوں کے ساتھ کیے جا سکتے ہیں، خدا پرستی ہی نہیں انکارِ خدا تک کے ساتھ کیے جا سکتے ہیں، اور ان میں ہر طرح کی دنیوی کامیابیاں ممکن ہیں لیکن اسلامی نظامِ زندگی کا برپا کرنا ایک ایسا کام ہے جس میں کوئی کامیابی اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک آدمی کا تعلق اللہ کے ساتھ صحیح اور مضبوط اور گہرا نہ ہو، اور اس کی نیت خالصتہً اللہ ہی کے لیے کام کرنے کی نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں جس چیز کو آدمی قائم کرنا چاہتا ہے وہ اللہ کا دین ہے، اور اسے قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی سب کچھ اُس خدا کے لیے کرے جس کا یہ دین ہے۔ اسی کی رضا اس کام میں مطلوب ہونی چاہیے اسی کی محبت اس کے لیے واحد محرک ہونی چاہیے۔ اسی کی تائید و نصرت پر کلی اعتماد ہونا چاہیے۔ اسی سے اجر کی ساری امیدیں وابستہ ہونی چاہئیں۔ اسی کی ہدایات اور اسی کے امر و نہی کا اس میں اتباع ہونا چاہیے۔ اور اسی کی پکڑ کا خوف دل پر چھایا رہنا چاہیے۔ اس کے سوا جس خوف اور جس لالچ اور جس محبت اور جس اتباع و اطاعت کی آمیزش بھی ہو گی، اور جو دوسری غرض بھی اس کام میں شامل ہو جائے گی وہ راہِ راست سے قدم ہٹا دے گی اور اس کے نتیجے میں اور جو کچھ بھی قائم ہو جائے، بہرحال اللہ کا دین قائم نہ ہو سکے گا۔

اسی سے قریب تر تعلق رکھنے والا دوسرا وصف فکرِ آخرت ہے۔ مومن کے کام کرنے کی جگہ اگرچہ دنیا ہے اور جو کچھ اسے کرنا ہے یہیں کرنا ہے، مگر وہ کام اس دنیا کے لیے نہیں کرتا بلکہ آخرت کے لیے کرتا ہے اور اس کا مطمحِ نظر دنیوی نتائج نہیں بلکہ اُخروی نتائج ہوتے ہیں۔ اسے ہر وہ کام کرنا چاہیے جو آخرت میں نافع ہے اور ہر اس مشغلے سے دستکش ہو جانا چاہیے جس کا وہاں کوئی حاصل نہیں نکلتا ہے۔ اسے ہر اس فائدے کو ٹھکرا دینا چاہیے جو آخرت میں نقصان کا موجب ہو اور ہر اس نقصان کو انگیز کر لینا چاہیے جو آخرت میں نفع بخش ہو۔ اسے فکر صرف آخرت کے عذاب و ثواب کی ہونی چاہیے؛ دنیا کے کسی عذاب و ثواب کی کوئی اہمیت اس کی نگاہ میں

نہ ہونی چاہیے۔ اس کی کوششیں اس دنیا میں بارآور ہوں یا نہ ہوں، یہاں اسے کامیابی ہوتی نظر آئے یا ناکامی، یہاں اس کی تعریف ہو یا مذمت، یہاں وہ انعام پائے یا آزمائشوں میں ڈالا جائے، ہر حال میں اس کو اس یقین کے ساتھ کام کرنا چاہیے کہ جس خدا کے لیے وہ یہ ساری محنتیں کر رہا ہے اس کی نگاہ سے کچھ پوشیدہ نہیں ہے، اور اس کے ہاں وہ آخرت کی ابدی جزا سے وہ ہرگز محروم نہ رہے گا، اور وہیں کی کامیابی اصل کامیابی ہے۔ اس ذہنیت کے بغیر آدمی کے لیے چند قدم بھی اس راہ میں صحیح رُخ پر چلنا ممکن نہیں ہے۔ دنیا کی مقصودیت کا لگاؤ کسی ادنیٰ درجے میں بھی اس کے ساتھ لگا رہ جائے تو وہ قدم قدم پر لغزش پیدا کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ راہ خدا میں ایک چوٹ نہیں تو دو چار چوٹیں آخر کار اُس شخص کی ہمتیں توڑ دیتی ہیں جو دنیوی کامیابیوں کو مقصود بنا کر چلتا ہے۔ اور اس راہ کی کوئی کامیابی کسی نہ کسی مرحلے پر اُس آدمی کے رویّے میں بگاڑ پیدا کر دیتی ہے جس کے دل کو دنیوی مقاصد کی کوئی چاٹ لگی ہوئی ہو۔

ان دو اوصاف کی تاثیر کو جو چیز عملاً ایک زبردست قوتِ تسخیر میں تبدیل کر دیتی ہے وہ حسنِ سیرت ہے۔ خدا کی راہ میں کام کرنے والے لوگوں کو عالی ظرف اور فراخ حوصلہ ہونا چاہیے، ہمدردِ خلائق اور خیر خواہِ انسانیت ہونا چاہیے، کریم النفس اور شریف الطبع ہونا چاہیے، خوددار اور خوگرِ قناعت ہونا چاہیے، متواضع اور منکسر المزاج ہونا چاہیے، شیریں کلام اور نرم خو ہونا چاہیے۔ وہ ایسے لوگ ہونے چاہئیں جن سے کسی کو شر کا اندیشہ نہ ہو اور ہر ایک ان سے خیر ہی کا متوقع ہو۔ جو اپنے حق سے کم پر راضی ہوں اور دوسروں کو ان کے حق سے زیادہ دینے پر تیار رہیں۔ جو برائی کا جواب بھلائی سے دیں، یا کم از کم برائی سے نہ دیں۔ جو اپنے عیوب کے معترف اور دوسروں کی بھلائیوں کے قدرداں ہوں۔ جو اتنا بڑا دل رکھتے ہوں کہ لوگوں کی کمزوریوں سے چشم پوشی کر سکیں، قصوروں کو معاف کر سکیں، زیادتیوں سے درگزر کر سکیں، اور اپنی ذات کے لیے کسی سے انتقام نہ لیں۔ جو خدمت لے کر نہیں خدمت کر کے خوش ہوتے ہوں، اپنی غرض کے لیے نہیں بلکہ دوسروں کی بھلائی کے لیے کام کریں، ہر تعریف سے بے نیاز اور ہر مذمت سے بے پروا ہو کر اپنا فرض انجام دیں اور خدا کے سوا کسی کے اجر پر نگاہ نہ رکھیں۔ جو طاقت سے دبائے نہ جا سکیں، دولت سے خریدے نہ جا سکیں، مگر حق اور راستی کے آگے بےتامل

سر جھکا دیں۔ جن کے دشمن بھی ان پر یہ بھروسہ رکھتے ہوں کہ کسی حال میں ان سے شرافت و دیانت اور انصاف کے خلاف کوئی حرکت سرزد نہیں ہوسکتی۔ یہ دلوں کو موہ لینے والے اخلاق ہیں۔ ان کی کاٹ تلوار کی کاٹ سے بڑھ کر اور ان کا سرمایہ سیم و زر کی دولت سے گراں تر ہے۔ کسی فرد کو یہ اخلاق میسر ہوں تو وہ اپنے گردوپیش کی آبادی کو مسخر کر لیتا ہے۔ لیکن اگر کوئی جماعت کی جماعت ان اوصاف سے متصف ہو اور پھر وہ کسی مقصد عظیم کے لیے منظم سعی بھی کر رہی ہو تو ملک کے ملک اس کے آگے مسخر ہوتے چلے جاتے ہیں، حتیٰ کہ دنیا کی کوئی طاقت اسے شکست دینے میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔

اس کے ساتھ ایک اور صفت بھی ہے جسے کامیابی کی کلید کہنا چاہیے، اور وہ ہے صبر۔ یہ ایک وسیع لفظ ہے جس کے بہت سے مفہومات ہیں اور راہِ خدا میں کام کرنے والوں کو ان میں سے ہر مفہوم کے لحاظ سے صابر ہونا چاہیے۔

صبر کا ایک مفہوم یہ ہے کہ آدمی جلد باز نہ ہو۔ اپنی کوششوں کے نتائج فوراً اور جلدی دیکھ لینے کے لیے بیتاب نہ ہو اور دیر لگتے دیکھ کر ہمت نہ ہار جائے۔ صابر آدمی کی خوبی یہ ہے کہ وہ تمام عمر ایک مقصد کے پیچھے مسلسل محنت کیے چلا جاتا ہے، اور پیہم ناکامیوں کے باوجود اپنے کام میں لگا رہتا ہے۔ اصلاح خلق اور تعمیر حیات کا کام ایسا صبر آزما ہے کہ اس صفت کے بغیر کوئی شخص اس سے عہدہ برا نہیں ہوسکتا۔ یہ بہرحال ہتھیلی پر سرسوں جمانا نہیں ہے۔

صبر کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ آدمی تلون اور ضعفِ رائے اور قلتِ عزم کی بیماری میں مبتلا نہ ہو۔ اس میں یہ صفت موجود ہو کہ جس راہ کو اس نے سوچ سمجھ کر اختیار کر لیا ہے اس پر ثابت قدم رہے، اور دل کے پورے عزم اور ارادے کی پوری قوت کے ساتھ اس پر بڑھتا چلا جائے۔

صبر ہی کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ آدمی مشکلات اور مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرے اور اپنے مقصد کی راہ میں جو تکلیف بھی پیش آجائے اسے ٹھنڈے دل کے ساتھ برداشت کرے۔ صابر آدمی کسی طوفان اور کسی سیلاب کے تھپیڑوں سے شکست خوردہ ہو کر منہ نہیں موڑتا۔

صبر کے مفہوم میں یہ بات بھی داخل ہے کہ آدمی زود رنج اور مشتعل مزاج نہ ہو بلکہ متحمل اور بردبار ہو۔

جس شخص کو اصلاح و تعمیر کا کام کرنا ہو اور جسے تعمیر کے لیے کچھ نہ کچھ ناگزیر تخریب بھی کرنی پڑے، خصوصیت کے ساتھ جبکہ یہ خدمت اسے مدتوں کی بگڑی ہوئی سوسائٹی میں انجام دینی ہو، اسے لامحالہ بڑی گندی اور گھناؤنی اور کمینہ قسم کی مخالفتوں سے سابقہ پیش آ کر رہتا ہے۔ اگر وہ اتنی طاقت نہیں رکھتا کہ گالیاں کھا کر ہنس دے، طعنے سن کر ٹال دے، الزام اور بہتان اور جھوٹے پروپیگنڈے کو یکسر نظرانداز کر کے پورے سکون و جمعیت خاطر کے ساتھ اپنا کام کرتا رہے، تو بہتر یہی ہے کہ وہ اس راہ میں قدم ہی نہ رکھے۔ اس لیے کہ یہ کانٹوں بھری راہ ہے۔ اس کا ہر کانٹا یہ عزم کیے بیٹھا ہے کہ آدمی اور جس طرف بھی جائے چلا جائے مگر اس سمت میں اسے ایک انچ بھی نہ بڑھنے دیا جائے گا۔ اس حالت میں جو شخص ہر کانٹے سے الجھنے لگے وہ کیا پیش قدمی کرے گا۔ یہاں تو ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جن کے دامن سے اگر کوئی کانٹا الجھ جائے تو وہ دامن کا وہ حصہ پھاڑ کر اس کے حوالے کر دیں اور ایک لمحہ کے لیے بھی اپنی راہ کھوٹی نہ کریں۔ یہ صبر صرف مخالفوں ہی کے مقابلے میں درکار نہیں ہے، بلکہ بسا اوقات اس راہ کے راہرو کو خود اپنے ساتھیوں سے بھی تلخ و ناگوار باتوں سے سابقہ پیش آ جاتا ہے اور ان کے معاملہ میں اگر وہ حلم و تحمل سے کام نہ لے تو پورے قافلے کی راہ مار سکتا ہے۔

صبر اس چیز کا نام بھی ہے کہ آدمی ہر خوف اور ہر لالچ کے مقابلے میں راہ راست پر جما رہے۔ شیطان کی ساری ترغیبات اور نفس کی تمام خواہشات کے علی الرغم اپنا فرض بجا لائے، حرام سے پرہیز کرے اور حدوداللہ پر قائم رہے۔ گناہ کی ساری لذتوں اور منفعتوں کو ٹھکرا دے اور نیکی و راستی کے ہر نقصان اور اس کی بدولت حاصل ہونے والی ہر محرومی کو انگیز کر جائے۔ اپنی آنکھوں سے دنیا پرستوں کی رونق حیات دیکھے اور اس پر ریجھنا تو در کنار دل میں ادنیٰ سی حسرت تک کو راہ نہ دے۔ اپنے سامنے دنیا طلبی کی راہیں کشادہ اور کامرانیوں کے مواقع موجود پائے اور دل کی پوری طمانیت کے ساتھ اُس متاعِ حیات پر راضی رہے جو اپنے مقصد کی خدمت کرتے ہوئے وہ اپنے رب کے فضل سے حاصل کر رہا ہو۔

صبر ان تمام معنوں میں کلید کامیابی ہے جس پہلو سے بھی ہمارے کام میں بے صبری کا دخل ہو گا، اس کا بُرا نتیجہ ظاہر ہو کر رہے گا۔

ان سب اوصاف کے ساتھ ایک نہایت اہم وصف حکمت ہے جس پر بہت بڑی حد تک کامیابی کا انحصار ہے۔ دنیا میں جو نظامِ زندگی بھی قائم ہیں ان کو اعلیٰ درجے کے ذہین اور ہوشیار لوگ چلا رہے ہیں اور ان کی پشت پر مادی وسائل کے ساتھ عقلی و فکری طاقتیں اور علمی و فنی قوتیں کام کر رہی ہیں۔ ان کے مقابلے میں ایک دوسرے نظام کو قائم کر دینا اور کامیابی کے ساتھ چلا لینا کچھ بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ یہ بسم اللہ کے گنبد میں رہنے والوں کے کرنے کا کام نہیں ہے۔ سادہ لوح لوگ خواہ کتنے ہی نیک اور نیک نیت ہوں، اس سے عہدہ برا نہیں ہو سکتے۔ اس کے لیے گہری بصیرت اور تدبر کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے دانشمندی اور معاملہ فہمی درکار ہے۔ اس کام کو وہی لوگ کر سکتے ہیں جو موقع شناس اور باتدبیر ہوں، اور زندگی کے مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ "حکمت" ان سب اوصاف کے لیے ایک جامع لفظ ہے اور اس کا اطلاق دانائی و زیرکی کے متعدد مظاہر پر ہوتا ہے۔

یہ حکمت ہے کہ آدمی انسانی نفسیات کی سمجھ رکھتا ہو اور انسانوں سے معاملہ کرنا جانتا ہو۔ لوگوں کے اذہان کو اپنی دعوت سے متاثر کرنے اور ان کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنے کے طریقوں سے واقف ہو۔ ہر شخص کو ایک ہی لگی بندھی دوا نہ دیتا چلا جائے بلکہ ہر ایک کے مزاج اور مرض کی صحیح تشخیص کر کے علاج کرے۔ سب کو ایک لکڑی نہ ہانکے بلکہ جن جن اشخاص اور طبقوں اور گروہوں سے اس کو سابقہ پیش آئے ان کے مخصوص حالات کو سمجھ کر ان کے ساتھ معاملہ کرے۔

یہ بھی حکمت ہے کہ آدمی اپنے کام کو اور اس کے کرنے کے طریقوں کو جانتا ہو اور اس کے راستے میں پیش آنے والی دشواریوں، مخالفتوں اور مزاحمتوں سے نمٹنا بھی اس کو آتا ہو۔ اسے ٹھیک ٹھیک معلوم ہونا چاہیے کہ جس مقصد کے لیے وہ سعی کرنے اٹھا ہے اس کے لیے اسے کیا کچھ کرنا ہے، کس کس طرح کرنا ہے، اور کس کس قسم کی رکاوٹوں کو کس طرح دفع کرنا ہے۔

یہ بھی حکمت ہی ہے کہ آدمی وقت کے حالات پر نظر رکھتا ہو، مواقع کو سمجھتا ہو اور یہ جانتا ہو کہ کس موقع پر کیا تدبیر کی جانی چاہیے۔ حالات کو سمجھے بغیر اندھا دھند قدم اٹھا دینا، بے موقع کام کرنا اور موقع پر چوک جانا، مفقل لوگوں کا کام ہے اور ایسے لوگ خواہ کتنے ہی پاکیزہ مقصد کے لیے کتنی ہی نیکی و نیک نیتی کے ساتھ

کام کر رہے ہوں، کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

اور ان سب حکمتوں سے بڑھ کر رأس الحکمت یہ ہے کہ آدمی دین میں تفقہ اور معاملات دنیا میں بصیرت رکھتا ہو۔ محض احکام اور مسائل شریعت سے واقف ہونا اور انہیں پیش آمدہ حوادث پر چسپاں کر دینا منصب افتاء کے لیے تو کافی ہو سکتا ہے، مگر بگڑے ہوئے معاشرے کو درست کرنے، اور نظام زندگی کو جاہلیت کی بنیادوں سے اکھاڑ کر دین کی بنیادوں پر از سر نو قائم کرنے کے لیے کافی نہیں ہو سکتا۔ اس مقصد کے لیے تو ضروری ہے کہ آدمی جزئیاتِ احکام کے ساتھ کلیاتِ احکام، بلکہ پورے نظام دین پر نظر رکھتا ہو، پھر احکام کے ساتھ اُن کی حکمت کا بھی اسے علم ہو، اور وقت کے اُن حالات و مسائل کو بھی وہ سمجھتا ہو جن میں ان احکام کو رائج کرنا مطلوب ہو۔

مطلوبہ اوصاف کے اس مرقع کو دیکھ کر بادی النظر میں ایک آدمی ہول کھا جاتا ہے اور یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ یہ کام تو پھر کاملین کے کرنے کا ہے، عام انسان کہاں سے اتنے وصف لے کر آ سکتے ہیں اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ ہر صفت کا ہر شخص میں بدرجۂ کمال پایا جانا لازم نہیں ہے، اور نہ یہی لازم ہے کہ کسی میں وہ پہلے ہی قدم پر اپنی پوری تربیت یافتہ شکل میں موجود ہو۔ ہمارا مقصود ان باتوں کو بیان کرنے سے صرف یہ بات ذہن نشین کرنا ہے کہ جو لوگ اس کام کو کرنے کے لیے اٹھیں وہ محض خدمتِ قوم کا ایک کام سمجھ کر یونہی کھڑے نہ ہو جائیں، بلکہ اپنے نفس کا جائزہ لے کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ اس کام کے لیے جو اوصاف مطلوب ہیں ان کا مادہ اُن کے اندر موجود ہے یا نہیں۔ بس مادہ اگر موجود ہے تو آغازِ کار کے لیے کافی ہے۔ اس کو نشوونما دینا اور اپنی استعداد کے مطابق زیادہ سے زیادہ ممکن حد تک ترقی دینا بعد کے مراحل سے تعلق رکھتا ہے جس طرح ایک ذرا سا بیج زمین میں جڑ پکڑنے کے بعد آہستہ آہستہ غذا پا کر تناور درخت بن جاتا ہے لیکن بیج ہی موجود نہ ہو تو کچھ بھی نہیں بن سکتا، اسی طرح صفاتِ مطلوبہ کا مادہ آدمی میں موجود ہو تو مناسب سعی و کوشش سے وہ بتدریج کمال تک پہنچ سکتا ہے مگر سرے سے مادہ ہی موجود نہ ہو تو کسی سعی اور تربیت سے اس کا پیدا ہو جانا ممکن نہیں ہے۔

تفہیم القرآن

الفرقان

(۳)

رحمان کے اصلی بندے وہ ہیں[۸] جو زمین پر نرم چال چلتے ہیں[۹] اور جاہل ان کے منہ آئیں تو

۸؎ یعنی جس رحمان کو سجدہ کرنے کے لیے تم سے کہا جا رہا ہے اور تم اس سے انحراف کرتے ہو اس کے پیدائشی بندے تو سب ہی ہیں، مگر اس کے محبوب و پسندیدہ بندے وہ ہیں جو شعوری طور پر بندگی اختیار کر کے یہ اوصاف اپنے اندر پیدا کرتے ہیں۔ نیز یہ کہ وہ سجدہ جس کی تمہیں دعوت دی جا رہی ہے، اس کے نتائج یہ ہیں جو اس کی بندگی قبول کرنے والوں کی زندگی میں نظر آتے ہیں، اور اس سے انکار کے نتائج وہ ہیں جو تم لوگوں کی زندگی میں عیاں ہیں۔ اس مقام پر اصل مقصود سیرت و اخلاق کے دو نمونوں کا تقابل ہے: ایک وہ نمونہ جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی قبول کرنے والوں میں پیدا ہو رہا تھا، اور دوسرا وہ جو جاہلیت پر جمے ہوئے لوگوں میں ہر طرف پایا جاتا تھا۔ لیکن اس تقابل کے لیے طریقہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ صرف پہلے نمونے کی نمایاں خصوصیات کو سامنے رکھ دیا، اور دوسرے نمونے کو ہر دیکھنے والی آنکھ اور سوچنے والے ذہن پر چھوڑ دیا کہ وہ آپ ہی مقابل کی تصویر کو دیکھے اور آپ ہی دونوں کا موازنہ کرے۔ اس کے بیان کی حاجت نہ تھی، کیونکہ وہ گرد و پیش سارے معاشرے میں موجود تھا۔

۹؎ یعنی تکبر کے ساتھ اکڑتے اور اینٹھتے ہوئے نہیں چلتے، جباروں اور مفسدوں کی طرح اپنی رفتار سے اپنا زور جتانے کی کوشش نہیں کرتے، بلکہ ان کی چال ایک شریف اور سلیم الطبع اور نیک مزاج آدمی کی سی چال ہوتی ہے۔ "نرم چال" سے مراد ضعیفانہ اور مریضانہ چال نہیں ہے، اور نہ وہ چال ہے جو ایک ریاکار آدمی اپنے انکسار کی نمائش کرنے یا اپنی خدا ترسی کا مظاہرہ کرنے کے لیے تصنع سے اختیار کرتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

کہہ دیتے ہیں کہ تم کو سلام۔ جو اپنے رب کے حضور سجدے اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں[۸۴]۔ جو دعائیں کرتے ہیں

خود اس طرح مضبوط قدم رکھتے ہوئے چلتے تھے کہ گویا نشیب کی طرف آ رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ کے متعلق روایات میں آیا ہے کہ انہوں نے ایک جوان آدمی کو مریل چال چلتے دیکھا تو روک کر پوچھا کیا تم بیمار ہو۔ اس نے عرض کیا نہیں۔ آپ نے درہ اٹھا کر اسے دھمکایا اور کہا کہ پوری قوت کے ساتھ چلو۔ اس سے معلوم ہوا کہ نرم چال سے مراد ایک بھلے مانس کی سی فطری چال ہے نہ کہ وہ جو بناوٹ سے منکسرانہ بنائی گئی ہو یا جس سے خواہ مخواہ کی مسکنت اور ضعیفی ٹپکتی ہو۔

مگر غور طلب پہلو یہ ہے کہ آدمی کی چال میں آخر وہ کیا اہمیت ہے جس کی وجہ سے اللہ کے نیک بندوں کی خصوصیات گنواتے ہوئے سب سے پہلے اس کا ذکر کیا گیا؟ اس سوال کو ذرا تامل کی نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کی چال محض اس کے انداز رفتار ہی کا نام نہیں ہے بلکہ درحقیقت وہ اس کے ذہن اور اس کی سیرت و کردار کی اولین ترجمان بھی ہوتی ہے۔ ایک عیار آدمی کی چال، ایک غنڈے بدمعاش کی چال، ایک ظالم و جابر کی چال، ایک خود پسند متکبر کی چال، ایک باوقار مہذب آدمی کی چال، ایک غریب مسکین کی چال، اور اسی طرح مختلف اقسام کے دوسرے آدمیوں کی چالیں ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہوتی ہیں کہ ہر ایک کو دیکھ کر بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کس چال کے پیچھے کس طرح کی شخصیت جلوہ گر ہے۔ پس آیت کا مدعا یہ ہے کہ رحمان کے بندوں کو تم عام آدمیوں کے درمیان چلتے پھرتے دیکھ کر ہی بغیر کسی سابقہ تعارف کے الگ پہچان لوگے کہ یہ کس طرز کے لوگ ہیں۔ اس بندگی نے ان کی ذہنیت اور ان کی سیرت کو جیسا کچھ بنا دیا ہے اُس کا اثر ان کی چال تک میں نمایاں ہے۔ ایک آدمی انہیں دیکھ کر پہلی نظر میں جان سکتا ہے کہ یہ شریف اور حلیم اور ہمدرد لوگ ہیں، ان سے کسی شر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

۸۳ جاہل سے مراد اَن پڑھ یا بے علم آدمی نہیں، بلکہ وہ شخص ہے جو جہالت پر اُتر آئے اور کسی شریف آدمی سے بدتمیزی کا برتاؤ کرنے لگے۔ رحمان کے بندوں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ گالی کا جواب گالی سے اور بہتان کا جواب بہتان سے اور اسی طرح کی ہر بیہودگی کا جواب ویسی ہی بیہودگی سے نہیں دیتے بلکہ جو ان کے ساتھ یہ رویہ اختیار کرتا ہے وہ اس کو سلام کر کے الگ ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَ قَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ، سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ، لَا نَبْتَغِى الْجٰهِلِيْنَ ﴿ ﴾ اور جب کوئی بیہودہ بات سنتے ہیں تو اسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ کہتے ہیں بھائی ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے۔ سلام ہے

کہ "اے ہمارے رب، جہنم کے عذاب سے ہم کو بچالے، اُس کا عذاب تو جان کا لاگو ہے، وہ تو بڑا ہی بُرا مستقر اور مقام ہے" ۔۵۲ جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں نہ بخل، بلکہ دونوں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتے ہیں

تم کو، ہم جاہلوں کے منہ نہیں لگتے " (القصص - رکوع ۶) -

۵۱ یعنی وہ اُن کے دن کی زندگی تھی اور یہ ان کی راتوں کی زندگی ہے۔ ان کی راتیں نہ عیاشی میں گزرتی ہیں، نہ ناچ گانے میں، نہ لہو ولعب میں، نہ گپوں اور افسانہ گوئیوں میں، اور نہ ڈاکے مارنے اور چوریاں کرنے میں۔ جاہلیت کے اِن معروف مشاغل کے برعکس یہ اِس معاشرے کے وہ لوگ ہیں جن کی راتیں خدا کے حضور کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے دعا و عبادت کرتے گزرتی ہیں۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ ان کی زندگی کے اس پہلو کو نمایاں کر کے پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً سورہ سجدہ میں فرمایا تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا "ان کی پیٹھیں بستروں سے الگ رہتی ہیں، اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے رہتے ہیں" (رکوع ۲)۔ اور سورہ ذاریات میں فرمایا كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ "یہ اہلِ جنت وہ لوگ تھے جو راتوں کو کم ہی سوتے تھے اور سحر کے اوقات میں مغفرت کی دعائیں مانگا کرتے تھے" (رکوع ۱)۔ اور سورہ زمر میں ارشاد ہوا اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ "کیا اُس شخص کا انجام کسی مشرک جیسا ہو سکتا ہے جو اللہ کا فرمانبردار ہو، رات کے اوقات میں سجدے کرتا اور کھڑا رہتا ہو، آخرت سے ڈرتا ہو اور اپنے رب کی رحمت کی آس لگائے ہوئے ہو؟" (رکوع ۱)۔

۵۲ یعنی یہ عبادت اُن میں کوئی غرور پیدا نہیں کرتی۔ انہیں اس بات کا کوئی زعم نہیں ہوتا کہ ہم تو اللہ کے پیارے اور اس کے چہیتے ہیں، بھلا آگ ہمیں کہاں چھو سکتی ہے۔ بلکہ اپنی ساری نیکیوں اور عبادتوں کے باوجود وہ اِس خوف سے کانپتے رہتے ہیں کہ کہیں ہمارے عمل کی کوتاہیاں ہم کو مبتلائے عذاب نہ کر دیں۔ وہ اپنے تقویٰ کے زور سے جنت جیت لینے کا پندار نہیں رکھتے، بلکہ اپنی انسانی کمزوریوں کا اعتراف کرتے ہوئے عذاب سے بچ نکلنے ہی کو غنیمت سمجھتے ہیں، اور اس کے لیے بھی ان کا اعتماد اپنے عمل پر نہیں بلکہ اللہ کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔

۵۳ یعنی نہ تو ان کا حال یہ ہے کہ عیاشی اور قمار بازی، اور شراب نوشی، اور یار باشی، اور میلوں ٹھیلوں، اور شادی بیاہ میں بے دریغ روپیہ خرچ کریں اور اپنی حیثیت سے بڑھ کر اپنی شان دکھانے کے لیے غذا، مکان، لباس اور

جو اللہ کے سوا کسی اور معبود کو نہیں پکارتے، اللہ کی حرام کی ہوئی کسی جان کو ناحق ہلاک نہیں کرتے، اور نہ زنا کے مرتکب ہوتے ہیں۸۴ ــــ یہ کام جو کوئی کرے وہ اپنے گناہ کا بدلہ پائے گا قیامت کے روز

تزئین و آرائش پر دولت لٹائیں۔ اور نہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ ایک زر پرست آدمی کی طرح پیسہ جوڑ جوڑ کر رکھیں، نہ خود کھائیں، نہ بال بچوں کی ضروریات اپنی استطاعت کے مطابق پوری کریں، اور نہ کسی راہ خیر میں خوش دلی کے ساتھ کچھ دیں۔ عرب میں یہ دونوں قسم کے نمونے کثرت سے پائے جاتے تھے۔ ایک طرف وہ لوگ تھے جو خوب دل کھول کر خرچ کرتے تھے، مگر ان کے ہر خرچ کا مقصود یا تو ذاتی عیش و تنعّم تھا، یا برادری میں ناک اونچی رکھنا اور اپنی فیاضی و دولت مندی کے ڈنکے بجوانا۔ دوسری طرف وہ بخیل تھے جن کی کنجوسی مشہور تھی۔ اعتدال کی روش بہت ہی کم لوگوں میں پائی جاتی تھی اور ان کم لوگوں میں اُس وقت سب سے زیادہ نمایاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ تھے۔

اس موقع پر یہ جان لینا چاہیے کہ اسراف کیا چیز ہے اور بخل کیا چیز۔ اسلامی نقطۂ نظر سے اسراف تین چیزوں کا نام ہے۔ ایک، ناجائز کاموں میں دولت صرف کرنا، خواہ وہ ایک پیسہ ہی کیوں نہ ہو۔ دوسرے، جائز کاموں میں خرچ کرتے ہوئے حد سے تجاوز کر جانا، خواہ اس لحاظ سے کہ آدمی اپنی استطاعت سے زیادہ خرچ کرے، یا اس لحاظ سے کہ آدمی کو جو دولت اس کی ضرورت سے بہت زیادہ مل گئی ہو اسے وہ اپنے ہی عیش اور ٹھاٹ باٹ میں صرف کرتا چلا جائے۔ تیسرے، نیکی کے کاموں میں خرچ کرنا مگر اللہ کے لیے نہیں بلکہ ریا اور نمائش کے لیے۔ اس کے برعکس بخل کا اطلاق دو چیزوں پر ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ آدمی اپنی اور اپنے بال بچوں کی ضروریات پر اپنی مقدرت اور حیثیت کے مطابق خرچ نہ کرے۔ دوسرے یہ کہ نیکی اور بھلائی کے کاموں میں اس کے ہاتھ سے پیسہ نہ نکلے۔ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال کی راہ اسلام کی راہ ہے جس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ من فقہ الرجل قصدہ فی معیشتہ، "اپنی معیشت میں توسط اختیار کرنا آدمی کے فقیہ (دانا) ہونے کی علامتوں میں سے ہے۔" (احمد و طبرانی، بروایت ابی الدرداء)۔

۸۴؎ یعنی وہ ان تین بڑے گناہوں سے پرہیز کرتے ہیں جن میں اہل عرب کثرت سے مبتلا ہیں۔ ایک شرک باللہ، دوسرے قتل ناحق، تیسرے زنا۔ اسی مضمون کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بکثرت احادیث میں بیان فرمایا ہے۔ مثلاً عبداللہ بن مسعود کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ آپ سے پوچھا گیا، سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟ فرمایا ان تجعل

للہ ندًا وھو خلقك " یہ کہ تو کسی کو اللہ کا مد مقابل اور ہمسر ٹھیرائے، حالانکہ تجھے پیدا اللہ نے کیا ہے۔" پوچھا گیا اس کے بعد۔ فرمایا ان تقتل ولدك خشیة ان یطعم معك " یہ کہ تم اپنے بچے کو اس خوف سے قتل کر ڈالے کہ وہ تیرے ساتھ کھانے میں شریک ہو جائے گا۔" پوچھا گیا پھر۔ فرمایا ان تزانی حلیلة جارك " یہ کہ تو اپنے ہمسائے کی بیوی سے زنا کرے" (بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، احمد)۔ اگرچہ کبیرہ گناہ اور بھی بہت سے ہیں، لیکن عرب کی سوسائٹی پر اُس وقت سب سے زیادہ تسلط انہی تین گناہوں کا تھا، اس لیے مسلمانوں کی اس خصوصیت کو نمایاں کیا گیا کہ پورے معاشرے میں یہ چند لوگ ہیں جو ان برائیوں سے بچ گئے ہیں۔

یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ مشرکین کے نزدیک تو شرک سے پرہیز کرنا ایک بہت بڑا عیب تھا پھر اسے مسلمانوں کی ایک خوبی کی حیثیت سے اُن کے سامنے پیش کرنے کی کونسی معقول وجہ ہو سکتی تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اہل عرب اگرچہ شرک میں مبتلا تھے اور سخت تعصب کی حد تک مبتلا تھے، مگر درحقیقت اس کی جڑیں اوپری سطح ہی تک محدود تھیں، کچھ گہری اُتری ہوئی نہ تھیں، اور دنیا میں کبھی کہیں بھی شرک کی جڑیں انسانی فطرت میں گہری اُتری ہوئی نہیں ہوتیں۔ اس کے برعکس خالص خدا پرستی کی عظمت ان کے ذہن کی گہرائیوں میں دبی ہوئی موجود تھی جس کو ابھارنے کے لیے اوپر کی سطح کو بس ذرا زور سے کھرچ دینے کی ضرورت تھی۔ جاہلیت کی تاریخ کے متعدد واقعات ان دونوں باتوں کی شہادت دیتے ہیں۔ مثلاً ابرہہ کے حملے کے موقع پر قریش کا بچہ بچہ یہ جانتا تھا کہ اس بلا کو وہ بُت نہیں ٹال سکتے جو خانہ کعبہ میں رکھے ہوئے ہیں بلکہ صرف اللہ تعالیٰ ہی ٹال سکتا ہے جس کا یہ گھر ہے۔ آج تک وہ اشعار اور قصائد محفوظ ہیں جو اصحاب الفیل کی تباہی پر ہم عصر شعراء نے کہے تھے۔ اُن کا لفظ لفظ گواہی دیتا ہے کہ وہ لوگ اس واقعہ کو محض اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کرشمہ سمجھتے تھے اور اس امر کا ادنیٰ سا گمان بھی نہ رکھتے تھے کہ اس میں اُن کے معبودوں کا کوئی دخل ہے۔ اسی موقع پر شرک کا یہ بدترین کرشمہ بھی قریش اور تمام مشرکین عرب کے سامنے آیا تھا کہ ابرہہ جب مکے کی طرف جاتے ہوئے طائف کے قریب پہنچا تو اہل طائف نے اس اندیشے سے کہ یہ کہیں اُن کے معبود "لات" کے مندر کو بھی نہ گرادے، اپنی خدمات کعبے کو منہدم کرنے کے لیے اس کے آگے پیش کر دیں اور اپنے بدرقے اس کے ساتھ کر دیئے تاکہ وہ پہاڑی راستوں سے اس لشکر کو بخیریت مکے تک پہنچا دیں۔ اس واقعہ کی تلخ یاد مدتوں تک قریش کو ستاتی رہی اور سالہا سال تک وہ اُس شخص کی قبر پر سنگ باری

کرتے رہے جو طائف کے بدرقے کا سردار تھا۔ علاوہ بریں قریش اور دوسرے اہلِ عرب اپنے دین کو حضرت ابراہیم کی طرف منسوب کرتے تھے، اپنے بہت سے مذہبی اور معاشرتی مراسم اور خصوصاً مناسکِ حج کو دینِ ابراہیمی ہی کے اجزاء قرار دیتے تھے، اور یہ بھی مانتے تھے کہ حضرت ابراہیم خالص خدا پرست تھے، بتوں کی پرستش انہوں نے کبھی نہیں کی۔ ان کے ہاں کی روایات میں یہ تفصیلات بھی محفوظ تھیں کہ بت پرستی اُن کے ہاں کب سے رائج ہوئی اور کون سا بت کب، کہاں سے، کون لایا۔ اپنے معبودوں کی جیسی کچھ عزت ایک عام عرب کے دل میں تھی اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جب کبھی اس کی دعاؤں اور تمناؤں کے خلاف کوئی واقعہ ظہور میں آجاتا تو بسا اوقات وہ معبود صاحب کی توہین بھی کر ڈالتا تھا اور اس کی نذر و نیاز سے ہاتھ کھینچ لیتا تھا۔ ایک عرب اپنے باپ کے قاتل سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔ ذو الخلصہ نامی بت کے آستانے پر جا کر اس نے فال کھلوائی۔ جواب نکلا یہ کام نہ کیا جائے۔ اس پر عرب طیش میں آگیا۔ کہنے لگا:

لوکنت یا ذا الخلص الموتورا   مثلی وکان شیخك المقبورا

لم تنه عن قتل العداۃ زورا

یعنی اے ذو الخلصہ، اگر میری جگہ تو ہوتا اور تیرا باپ مارا گیا ہوتا تو ہرگز تو یہ جھوٹی بات نہ کہتا کہ ظالموں سے بدلہ نہ لیا جائے۔ ایک اور عرب صاحب اپنے اونٹوں کا گلہ اپنے معبود سَعْد نامی کے آستانے پر لے گئے تاکہ ان کے لیے برکت حاصل کریں۔ یہ ایک لمبا تڑنگا بت تھا جس پر قربانیوں کا خون لتھڑا ہوا تھا۔ اونٹ اسے دیکھ کر بھڑک گئے اور ہر طرف بھاگ نکلے۔ عرب اپنے اونٹوں کو اس طرح تتر بتر ہوتے دیکھ کر غصے میں آگیا۔ بت پر پتھر مارتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ "خدا تیرا ستیاناس کرے۔ میں آیا تھا برکت لینے کے لیے اور تو نے میرے رہے سہے اونٹ بھی بھگا دیئے"۔ متعدد بت ایسے تھے جن کی اصلیت کے متعلق نہایت گندے قصے مشہور تھے۔ مثلاً اساف اور نائلہ جن کے مجسمے صفا اور مروہ پر رکھے ہوئے تھے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ دونوں دراصل ایک عورت اور ایک مرد تھے جنہوں نے خانۂ کعبہ میں زنا کا ارتکاب کیا تھا اور خدا نے ان کو پتھر بنا دیا۔ یہ حقیقت جن معبودوں کی ہو ظاہر ہے کہ ان کی کوئی حقیقی عزت تو عابدوں کے دل میں نہیں ہو سکتی۔ ان مختلف پہلوؤں کو نگاہ میں رکھا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے کہ خالص خدا پرستی کی ایک گہری قدر و منزلت تو دلوں میں موجود تھی، مگر ایک

اُس کو مکرر عذاب دیا جائے گا۵۵ اور اسی میں وہ ذلّت کے ساتھ پڑا رہے گا۔ الّا یہ کہ کوئی ان گناہوں کے بعد توبہ کر چکا ہو اور ایمان لا کر عمل صالح کرنے لگا ہو۵۶۔ ایسے لوگوں کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں سے

طرف جاہلانہ قدامت پرستی نے اس کو دبا رکھا تھا، اور دوسری طرف قریش کے پروہت اس کے خلاف تعصبات بھڑکاتے رہتے تھے، کیونکہ بتوں کی عقیدت ختم ہو جانے سے ان کو اندیشہ تھا کہ عرب میں ان کو جو مرکزیت حاصل ہے وہ ختم ہو جائے گی اور ان کی آمدنی میں بھی فرق آ جائے گا۔ ان سہاروں پر جو مذہب شرک قائم تھا وہ توحید کی دعوت کے مقابلے میں کسی وقار کے ساتھ کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی لیے قرآن نے خود مشرکین کو خطاب کر کے بے تکلف کہا کہ تمہارے معاشرے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرؤں کو جن وجوہ سے برتری حاصل ہے ان میں سے ایک اہم ترین وجہ ان کا شرک سے پاک ہونا اور خالص خدا پرستی پر قائم ہو جانا ہے۔ اِس پہلو سے مسلمانوں کی برتری کو زبان سے ماننے کے لیے چاہے مشرکین تیار نہ ہوں، مگر دلوں میں اس کا وزن محسوس کرتے تھے۔

۵۵ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ عذاب کا سلسلہ ٹوٹنے نہ پائے گا، بلکہ پے در پے جاری رہے گا۔ دوسرے یہ کہ جو شخص کفر یا شرک یا دہریت والحاد کے ساتھ قتل اور زنا اور دوسری معصیتوں کا بوجھ لیے ہوئے جائیگا اُس کو بغاوت کی سزا الگ ملے گی اور ایک ایک جرم کی سزا الگ الگ۔ اس کا ہر چھوٹا بڑا قصور حساب میں آئے گا۔ کوئی ایک خطا بھی معاف نہ ہو گی۔ قتل کی سزا ایک نہیں ہو گی بلکہ ہر فعلِ قتل کی الگ سزا اس کو بھگتنی ہو گی۔ زنا کی سزا بھی ایک نہیں ہو گی بلکہ جتنی بار وہ اِس جرم کا مرتکب ہوا ہے اس کی جداگانہ سزا پائے گا۔ اور یہی حال دوسرے تمام جرائم اور معاصی کے معاملے میں بھی ہو گا۔

۵۶ یہ بشارت ہے اُن لوگوں کے لیے جن کی زندگی پہلے طرح طرح کے جرائم سے آلودہ رہی ہو اور اب وہ اپنی اصلاح پر آمادہ ہوں۔ یہی عام معافی (GENERAL AMNESTY) کا اعلان تھا جس نے اُس بگڑے ہوئے معاشرے کے لاکھوں افراد کو سہارا دے کر مستقل بگاڑ سے بچا لیا۔ اِسی نے ان کو امید کی روشنی دکھائی اور اصلاحِ حال پر آمادہ کیا۔ ورنہ اگر ان سے یہ کہا جاتا کہ جو گناہ تم کر چکے ہو ان کی سزا سے اب تم کسی طرح نہیں بچ سکتے، تو یہ انہیں مایوس کر کے ہمیشہ کے لیے بدی کے بھنور میں پھنسا دیتا اور کبھی ان کی اصلاح نہ ہو سکتی۔ مجرم انسان کو صرف معافی کی امید ہی جرم کے چکر سے نکال سکتی ہے۔ مایوس ہو کر وہ ابلیس بن جاتا ہے۔

بدل دیگا اور وہ بڑا غفور و رحیم ہے۔ جو شخص توبہ کر کے نیک عمل اختیار کرتا ہے وہ تو اللہ کی طرف پلٹ

توبہ کی اس نعمت نے عرب کے بگڑے ہوئے لوگوں کو کس طرح سنبھالا، اس کا اندازہ اُن بہت سے واقعات سے ہوتا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پیش آئے۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ ملاحظہ ہو جسے ابن جریر اور طبرانی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک روز میں مسجد نبوی سے عشا کی نماز پڑھ کر پلٹا تو دیکھا کہ ایک عورت میرے دروازے پر کھڑی ہے۔ میں اس کو سلام کر کے اپنے حجرے میں چلا گیا اور دروازہ بند کر کے نوافل پڑھنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور پوچھا کیا چاہتی ہے۔ وہ کہنے لگی میں آپ سے ایک سوال کرنے آئی ہوں۔ مجھ سے زنا کا ارتکاب ہوا، ناجائز حمل ہوا، بچہ پیدا ہوا تو میں نے اسے مار ڈالا۔ اب میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ میرا گناہ معاف ہونے کی بھی کوئی صورت ہے۔ میں نے کہا ہرگز نہیں۔ وہ بڑی حسرت کے ساتھ آہیں بھرتی ہوئی واپس چلی گئی، اور کہنے لگی "افسوس، یہ حسن آگ کے لیے پیدا ہوا تھا"۔ صبح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھ کر جب میں فارغ ہوا تو میں نے حضورؐ کو رات کا قصہ سنایا۔ آپ نے فرمایا، بڑا غلط جواب دیا ابوہریرہ تم نے، کیا یہ آیت قرآن میں تم نے نہیں پڑھی وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ ... إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا؟ حضورؐ کا یہ جواب سن کر میں نکلا اور اس عورت کو تلاش کرنا شروع کیا۔ رات کو عشا ہی کے وقت وہ ملی۔ میں نے اسے بشارت دی اور بتایا کہ سرکارِ رسالتمآب نے تیرے سوال کا یہ جواب دیا ہے۔ وہ سنتے ہی سجدے میں گر گئی اور کہنے لگی شکر ہے اس خدائے پاک کا جس نے میرے لیے معافی کا دروازہ کھولا۔ پھر اس نے گناہ سے توبہ کی اور اپنی لونڈی کو اس کے بیٹے سمیت آزاد کر دیا۔ اسی سے ملتا جلتا واقعہ احادیث میں ایک بڈھے کا آیا ہے جس نے آکر حضورؐ سے عرض کیا تھا کہ یا رسول اللہ! ساری زندگی گناہوں میں گزری ہے۔ کوئی گناہ ایسا نہیں جس کا ارتکاب نہ کر چکا ہوں، اپنے گناہ تمام روئے زمین کے باشندوں پر بھی تقسیم کر دوں تو سب کو لے ڈوبیں۔ کیا اب بھی میری معافی کی کوئی صورت ہے؟ فرمایا، کیا تو نے اسلام قبول کر لیا ہے؟ اس نے عرض کیا میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔ فرمایا جا، اللہ معاف کرنے والا ہے اور تیری برائیوں کو بھلائی سے بدل دینے والا ہے۔ اس نے عرض کیا میرے سارے جرم اور قصور؟ فرمایا، ہاں، تیرے سارے جرم اور قصور (ابن کثیر بحوالہ ابن ابی حاتم)

آتا ہے جو پلٹنے کی اصل جگہ ہے ۸۸؎ ـــــــ اور رحمان کے بندے وہ ہیں جو جھوٹ کے گواہ نہیں بنتے ۸۹؎

۸۷؎ اس کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ توبہ کر لیں گے تو کفر کی زندگی میں جو بُرے افعال وہ پہلے کیا کرتے تھے ان کی جگہ اب طاعت اور ایمان کی زندگی میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے نیک افعال کرنے لگیں گے اور تمام برائیوں کی جگہ بھلائیاں لے لیں گی۔ دوسرے یہ کہ توبہ کے نتیجہ میں صرف اتنا ہی نہ ہوگا کہ ان کے نامۂ اعمال سے وہ تمام قصور کاٹ دیئے جائیں گے جو انہوں نے کفر و گناہ کی زندگی میں کیے تھے، بلکہ ان کی جگہ ہر ایک کے نامۂ اعمال میں یہ نیکی لکھی جائے گی کہ یہ وہ بندہ ہے جس نے بغاوت اور نافرمانی کو چھوڑ کر طاعت و فرمانبرداری اختیار کر لی۔ پھر جتنی بار بھی وہ اپنی سابقہ زندگی کے بُرے اعمال کو یاد کر کے نادم ہُوا ہوگا اور اس نے اپنے خدا سے استغفار کیا ہوگا، اس کے حساب میں اتنی ہی نیکیاں لکھ دی جائیں گی، کیونکہ خطا پر شرمسار ہونا اور معافی مانگنا بجائے خود ایک نیکی ہے۔ اس طرح اس کے نامۂ اعمال میں تمام پچھلی برائیوں کی جگہ بھلائیاں لے لیں گی۔ اور اس کا انجام صرف سزا سے بچ جانے ہی تک محدود نہ رہے گا بلکہ وہ الٹا انعامات سے سرفراز ہوگا۔

۸۸؎ یعنی فطرت کے اعتبار سے بھی بندے کا اصلی مرجع اسی کی بارگاہ ہے، اور اخلاقی حیثیت سے بھی وہی ایک بارگاہ ہے جس کی طرف اسے پلٹنا چاہیے، اور نتیجے کے اعتبار سے بھی اسی بارگاہ کی طرف پلٹنا مفید ہے ورنہ کوئی دوسری جگہ ایسی نہیں ہے جدھر رجوع کر کے وہ سزا سے بچ سکے یا ثواب پا سکے۔ علاوہ بریں اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ وہ پلٹ کر ایک ایسی بارگاہ کی طرف جاتا ہے جو واقعی ہے ہی پلٹنے کے قابل جگہ، بہترین بارگاہ جہاں سے تمام بھلائیاں ملتی ہیں، جہاں سے قصوروں پر شرمسار ہونے والے دھتکارے نہیں جاتے بلکہ معافی اور انعام سے نوازے جاتے ہیں، جہاں معافی مانگنے والے کے جرم نہیں گنے جاتے بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس نے توبہ کر کے اپنی اصلاح کتنی کر لی، جہاں بندے کو وہ آقا ملتا ہے جو انتقام پر ادھار کھائے نہیں بیٹھا ہے بلکہ اپنے ہر شرمسار غلام کے لیے دامنِ رحمت کھولے ہوئے ہے۔

۸۹؎ اس کے بھی دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ وہ کسی جھوٹی بات کی گواہی نہیں دیتے اور کسی ایسی چیز کو واقعہ اور حقیقت قرار نہیں دیتے جس کے واقعہ اور حقیقت ہونے کا انہیں علم نہ ہو، یا جس کے خلاف واقعہ حقیقت ہونے کا انہیں اطمینان ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ جھوٹ کا مشاہدہ نہیں کرتے، اس کے تماشائی نہیں بنتے،

اور کسی لغو چیز پر ان کا گزر ہو جائے تو شریف آدمیوں کی طرح گزر جاتے ہیں۔[۹۵] جنہیں اگر ان کے رب کی آیات سنا کر نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اس پر اندھے اور بہرے بن کر نہیں رہ جاتے۔[۹۶] جو دعائیں مانگا

اس کو دیکھنے کا قصد نہیں کرتے۔ اس دوسرے مطلب کے اعتبار سے "جھوٹ" کا لفظ باطل اور شر کا ہم معنی ہے انسان جس برائی کی طرف بھی جاتا ہے، لذت یا خوشنمائی یا ظاہری فائدے کے اُس جھوٹے ملمع کی وجہ سے جاتا ہے جو شیطان نے اس پر چڑھا رکھا ہے۔ یہ ملمع اُتر جائے تو ہر بدی سراسر کھوٹ ہی کھوٹ ہے جس پر انسان کبھی نہیں ریجھ سکتا۔ لہٰذا ہر باطل، ہر گناہ اور ہر بدی اس لحاظ سے جھوٹ ہے کہ وہ اپنی جھوٹی چمک دمک کی وجہ ہی سے اپنی طرف لوگوں کو کھینچتی ہے۔ مومن چونکہ حق کی معرفت حاصل کر لیتا ہے، اس لیے وہ اس جھوٹ کو ہر روپ میں پہچان جاتا ہے، خواہ وہ کیسے ہی دلفریب دلائل، یا نظر فریب آرٹ، یا سماعت فریب خوش آوازیوں کا جامہ پہن کر آئے۔

۹۵ "لغو" کا لفظ اُس "جھوٹ" پر بھی حاوی ہے جس کی تشریح اوپر کی جا چکی ہے، اور اس کے ساتھ تمام فضول، لایعنی اور بے فائدہ باتیں اور کام بھی اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ اللہ کے صالح بندوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جان بوجھ کر اس طرح کی چیزیں دیکھنے یا سننے یا ان میں حصہ لینے کے لیے نہیں جاتے، اور اگر کبھی ان کے راستے میں ایسی کوئی چیز آ جائے تو ایک نگاہِ غلط انداز تک ڈالے بغیر اُس پر سے اس طرح گزر جاتے ہیں جیسے ایک نفیس مزاج آدمی گندگی کے ڈھیر سے گزر جاتا ہے۔ غلاظت اور تعفن سے دلچسپی ایک بدذوق اور پلید آدمی تو لے سکتا ہے مگر ایک خوش ذوق اور مہذب انسان مجبوری کے بغیر اس کے پاس سے بھی گزرنا گوارا نہیں کر سکتا، کجا کہ وہ بدبو سے مستفید ہونے کے لیے ایک سانس بھی وہاں لے۔

۹۶ اصل میں الفاظ ہیں لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا، جن کا لفظی ترجمہ یہ ہے: "وہ ان پر اندھے بہرے بن کر نہیں گرتے"۔ لیکن یہاں "گرنے" کا لفظ اپنے لغوی معنی کے لیے نہیں بلکہ محاورے کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ جیسے ہم اُردو میں کہتے ہیں "جہاد کا حکم سن کر بیٹھے رہ گئے"۔ اس میں "بیٹھنے" کا لفظ اپنے لغوی معنی میں نہیں بلکہ جہاد کے لیے حرکت نہ کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایسے لوگ نہیں ہیں جو اللہ کی آیات سُن کر ٹس سے مس نہ ہوں، بلکہ وہ ان کا گہرا اثر قبول کرتے ہیں۔ جو ہدایت اُن آیات

کرتے ہیں کہ "اے ہمارے رب، ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے[۹۲] اور ہم کو پرہیزگاروں کا امام بنا دے"[۹۳] — یہ ہیں وہ لوگ جو اپنے صبر کا پھل[۹۴] منزلِ بلند کی شکل میں پائیں گے۔[۹۵]

میں آتی ہو اُس کی پیروی کرتے ہیں، جس چیز کو فرض قرار دیا گیا ہو اُسے بجا لاتے ہیں، جس چیز کی مذمت بیان کی گئی ہو اُس سے رُک جاتے ہیں، اور جس عذاب سے ڈرایا گیا ہو اُس کے تصور سے کانپ اُٹھتے ہیں۔

۹۲؎ یعنی اُن کو ایمان اور عملِ صالح کی توفیق دے اور پاکیزہ اخلاق سے آراستہ کر۔ کیونکہ ایک مومن کو بیوی بچوں کے حسن و جمال اور عیش و آرام سے نہیں بلکہ ان کی نیک خصالی سے ٹھنڈک حاصل ہوتی ہے۔ اس کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی چیز تکلیف دہ نہیں ہو سکتی کہ جو دنیا میں اس کو سب سے زیادہ پیارے ہیں انہیں وہ دوزخ کا ایندھن بننے کے لیے تیار ہوتے دیکھے۔ ایسی صورت ہو تو بیوی کا حسن اور بچوں کی جوانی و لیاقت اُس کے لیے اور بھی زیادہ سوہانِ روح ہو گی، کیونکہ وہ ہر وقت اس رنج میں مبتلا رہے گا کہ یہ سب اپنی اِن خوبیوں کے باوجود اللہ کے عذاب میں گرفتار ہونے والے ہیں۔

یہاں خاص طور پر یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ جس وقت یہ آیات نازل ہوئی ہیں وہ وقت وہ تھا جبکہ مکہ کے مسلمانوں میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جس کے محبوب ترین رشتہ دار کفر و جاہلیت میں مبتلا نہ ہوں۔ کوئی مرد ایمان لے آیا تھا تو اس کی بیوی ابھی کافر تھی۔ کوئی عورت ایمان لے آئی تھی تو اس کا شوہر ابھی کافر تھا۔ کوئی نوجوان ایمان لے آیا تھا تو اس کے ماں باپ اور بھائی بہن، سب کے سب کفر میں مبتلا تھے۔ اور کوئی باپ ایمان لے آیا تھا تو اس کے اپنے جوان جوان بچے کفر پر قائم تھے۔ اس حالت میں ہر مسلمان ایک شدید روحانی اذیت میں مبتلا تھا اور اس کے دل سے وہ دعا نکلتی تھی جس کی بہترین ترجمانی اس آیت میں کی گئی ہے۔ آنکھوں کی ٹھنڈک نے اس کیفیت کی تصویر کھینچ دی ہے کہ اپنے پیاروں کو کفر و جاہلیت میں مبتلا دیکھ کر ایک آدمی کو ایسی اذیت ہو رہی ہے جیسے اس کی آنکھیں آشوبِ چشم سے اُبل آئی ہوں اور کھٹک سے سوئیاں سی چبھ رہی ہوں۔ اس سلسلۂ کلام میں ان کی اس کیفیت کو دراصل یہ بتانے کے لیے بیان کیا گیا ہے کہ وہ جس دین پر ایمان لائے ہیں پورے خلوص کے ساتھ لائے ہیں۔ ان کی حالت اُن لوگوں کی سی نہیں ہے جن کے خاندان کے لوگ مختلف مذہبوں اور پارٹیوں میں شامل رہتے ہیں اور سب مطمئن رہتے ہیں کہ چلو، ہر بینک میں ہمارا کچھ نہ کچھ سرمایہ موجود ہے۔

آداب و تسلیمات سے ان کا استقبال ہو گا۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ وہاں رہیں گے۔ کیا ہی اچھا ہے وہ مستقر اور وہ مقام۔

اے محمدؐ، لوگوں سے کہو کہ "میرے رب کو تمہاری کیا حاجت پڑی ہے اگر تم اس کو نہ پکارو۔[۹۶] اب ع
کہ تم نے جھٹلا دیا ہے عنقریب وہ سزا پاؤ گے کہ جان چھڑانی محال ہو گی۔" ع

۹۳ یعنی ہم تقویٰ اور طاعت میں سب سے بڑھ جائیں، بھلائی اور نیکی میں سب سے آگے نکل جائیں، محض نیک ہی نہ ہوں بلکہ نیکوں کے پیشوا ہوں اور ہماری بدولت دنیا بھر میں نیکی پھیلے۔ اس چیز کا ذکر بھی یہاں دراصل یہ بتانے کے لیے کیا گیا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو مال و دولت اور شوکت و حشمت میں نہیں بلکہ نیکی و پرہیزگاری میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر کچھ اللہ کے بندے دنیا میں ایسے ہیں جنہوں نے اس آیت کو بھی امامت کی امیدواری اور ریاست کی طلب کے لیے دلیل جواز کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اُن کے نزدیک آیت کا مطلب یہ ہے کہ "یا اللہ متقی لوگوں کو ہماری رعیت، اور ہم کو اُن کا حکمران بنا دے۔" اس سخن فہمی کی داد "امیدواروں" کے سوا اور کون دے سکتا ہے۔

۹۴ صبر کا لفظ یہاں اپنے وسیع ترین مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ دشمنانِ حق کے مظالم کو مردانگی کے ساتھ برداشت کرنا۔ دینِ حق کو قائم اور سربلند کرنے کی جدوجہد میں ہر قسم کے مصائب اور تکلیفوں کو سہہ جانا۔ ہر خوف اور لالچ کے مقابلے میں راہ راست پر ثابت قدم رہنا۔ شیطان کی تمام ترغیبات اور نفس کی ساری خواہشات کے علی الرغم فرض کو بجا لانا اور حرام سے پرہیز کرنا اور حدود اللہ پر قائم رہنا۔ گناہ کی ساری لذتوں اور منفعتوں کو ٹھکرا دینا اور نیکی و راستی کے ہر نقصان اور اس کی بدولت حاصل ہونے والی ہر محرومی کو انگیز کر جانا۔ غرض اِس ایک لفظ کے اندر دین اور دینی رویّے اور دینی اخلاق کی ایک دنیا کی دنیا سمو کر رکھ دی گئی ہے۔

۹۵ اصل میں لفظ غُرْفَہ استعمال ہوا ہے جس کے معنی بلند و بالا عمارت کے ہیں۔ اس کا ترجمہ عام طور پر "بالاخانہ" کیا جاتا ہے جس سے آدمی کے ذہن میں ایک دو منزلہ کوٹھے کی سی تصویر آجاتی ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں انسان جو بڑی سے بڑی اور اونچی سے اونچی عمارتیں بناتا ہے، حتیٰ کہ ہندوستان کا روضۂ تاج

اور امریکہ کے "فلک شگاف" (SKY SCRAPERS) تک جنت کے اُن محلات کی محض ایک بھونڈی نقل ہیں جن کا ایک دھندلا سا نقشہ اولادِ آدم کے لاشعور میں محفوظ چلا آتا ہے۔

۶ یعنی اگر تم اللہ سے دعائیں نہ مانگو، اور اس کی عبادت نہ کرو، اور اپنی حاجات کے لیے اس کو مدد کے لیے نہ پکارو، تو پھر تمہارا کوئی وزن بھی اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ پرِ کاہ کے برابر بھی تمہاری پرواکرے۔ محض مخلوق ہونے کی حیثیت سے تم میں اور پتھروں میں کوئی فرق نہیں۔ تم سے اللہ کی کوئی حاجت اٹکی ہوئی نہیں ہے کہ تم بندگی نہ کروگے تو اس کا کوئی کام رُکا رہ جائے گا۔ اس کی نگاہِ التفات کو جو چیز تمہاری طرف مائل کرتی ہے وہ تمہارا اُس کی طرف ہاتھ پھیلانا اور اس سے دعائیں مانگنا ہی ہے۔ یہ کام نہ کروگے تو کوڑے کرکٹ کی طرح پھینک دیئے جاؤگے۔

تزکیۂ نفس

بیماریوں کا علاج

(مولانا امین احسن اصلاحی)

پچھلی دو فصلوں[1] میں ہم نے ان بیماریوں کی نشان دہی کی ہے جو علم و معرفت کے لیے مہلک ہیں۔ یہ بیماریاں یوں تو بہت سی ہو سکتی ہیں لیکن ہم نے صرف دس ایسی بیماریوں کا پتہ دیا ہے جو جڑ کی حیثیت رکھتی ہیں اور جن میں سے ایک ایک کے اندر سے صدہا روحانی و اخلاقی بیماریوں کی شاخیں پھوٹی ہیں۔ ان میں سے چار بیماریاں تو جیسا کہ ہم نے بتایا ہے، ایسی ہیں جو اگر کسی شخص میں پائی جائیں تو اس کے اندر حق طلبی اور حق شناسی کا داعیہ ہی سرے سے مردہ ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے حالات پر ایسا قانع، اپنے علم پر ایسا مطمئن اور اپنے ماحول میں ایسا مست یا غافل ہوتا ہے کہ نہ تو خود اس کے اپنے اندر سے کسی قسم کی طلب یا پیاس ابھرتی ہے اور نہ کسی کے توجہ دلانے ہی پر اس کے اندر کوئی حرکت پیدا ہوتی ہے، بلکہ بعض حالات میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر اس کا کوئی ہمدرد و خیر خواہ اس کی بے حسی یا بے راہ روی پر ٹوک دے تو وہ اس کی اس ہمدردی کی قدر کرنے کے بجائے اُلٹا اس کے سر ہو جایا کرتا ہے کہ اس نے اس کو کیوں ٹوکا؟ وہ اپنے آپ کو مریض سمجھنے میں اپنی ہتک محسوس کرتا ہے۔ اس کو اس تصور سے بھی غصہ آتا ہے کہ کوئی شخص خود اس کے اندر بھی کسی مرض کی نشان دہی کر سکتا ہے یا اس کا علاج کر سکتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو نہ صرف تندرست و توانا خیال کرتا ہے بلکہ بعض حالات میں وہ دوسروں کا معالج اور طبیب بھی بنا بیٹھا ہوتا ہے، پھر وہ کس طرح گوارا کرے کہ دوسرے آ کر اس کے پندار حذاقت کو مجروح کریں اور وہ ان کے مشورے قبول کر کے دوسروں کی نظروں سے اپنے آپ کو

---

[1] یہ دونوں فصلیں ترجمان القرآن جلد ۳۴ عدد ۲ اور جلد ۳۴ عدد ۳ میں بالترتیب "حجابات علم" اور "آفات علم" کے عنوانات سے شائع ہوئی ہیں۔ چونکہ یہ فصل اسی بحث کی تکمیل کرتی ہے جو مذکورہ دونوں فصلوں میں گزر چکی ہے اس وجہ سے مناسب ہوگا اگر اس کو پڑھتے وقت ان فصلوں کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔ (امین احسن)

گر لئے اور اپنی بھی جمائی دکان ختم کر دے۔

اسی طرح ہم نے بتایا ہے کہ ان میں سے چھ بیماریاں ایسی ہیں جو اگر کسی صاحبِ علم و معرفت کو لگ جائیں تو اس کی تمام حاصل کردہ دولتِ معرفت برباد ہو جایا کرتی ہے۔ علم و ایمان کا جو ذخیرہ اس نے جمع کیا ہوا ہوتا ہے وہ بالکل ضائع ہو جاتا ہے۔ تربیتِ اخلاق اور تزکیۂ نفس کے جو مراحل وہ طے کر چکا ہوتا ہے وہ سارے کے سارے ناطے کردہ بن کر رہ جاتے ہیں۔ وہ جہاں سے اس راہ میں چلا ہوتا ہے وہیں پھر پلٹ جاتا ہے بلکہ بسا اوقات اس سے بھی پیچھے پھینک دیا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کے لئے توفیقِ خیر کے دروازے ہی بند ہو جاتے ہیں اور وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بقول نہ صرف اتنے ہی سے محروم کر دیا جاتا ہے جو اسے بخشا گیا تھا بلکہ وہ بھی اس سے چھین لیا جاتا ہے جو اس کے اپنے پاس موجود ہوتا ہے۔

ہماری جسمانی بیماریوں میں جو اہمیت دق اور سل، کوڑھ اور جذام وغیرہ کو حاصل ہے ان سے زیادہ اہمیت ہماری روحانی و اخلاقی بیماریوں میں ان امراض کو حاصل ہے۔ اس وجہ سے ہم صرف ان کے بیان کر دینے ہی پر اکتفا نہیں کرنا چاہتے بلکہ اپنے علم کی حد تک کتاب و سنت کی روشنی میں ان کے پیدا ہونے کے اسباب اور ان کے ازالہ کی تدابیر پر بھی گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

علاج کے بیان میں بعض مصالح کی بنا پر ہم ترتیب اس سے بالکل مختلف اختیار کریں گے جو ہم نے امراض کے بیان میں اختیار کی ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے ہم اس مرض کا علاج بیان کریں گے جس کا ذکر ہم نے سب سے آخر میں کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ جس کی اصلاح کی سب سے زیادہ توقع ہو سکتی ہے، وہ زیادہ تر اسی بیماری کا شکار ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ جو اللہ کے بندے شیر اور ہاتھی پر کمند ڈال سکتے تھے ان کا سارا وقت شکارِ مگس میں برباد ہو رہا ہے۔

اشتغال بالادنیٰ کے اسباب اور اس کے ازالہ کی تدابیر

اعلیٰ کو چھوڑ کر ادنیٰ اور شریف کو نظر انداز کر کے کسی حقیر و ذلیل کام کو انسان بس یونہی نہیں اختیار کر لیتا ہے، انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے پست اور رذیل نہیں بنایا گیا ہے کہ وہ خواہ مخواہ پستیوں ہی کی طرف جھکے اور گھٹیا باتوں ہی کو پسند کرے۔ اپنی فطرت کے لحاظ سے تو وہ حق طلب، خیر پسند اور اعلیٰ اقدار کا قدردان پیدا کیا گیا ہے لیکن کچھ خاص اسباب ہوتے ہیں

جن کی وجہ سے وہ بسا اوقات اعلیٰ کو چھوڑ کر ادنیٰ اور خوب کو نظر انداز کر کے ناخوب کو اختیار کر لیتا ہے اور پھر اسی کے پیچھے اپنی بیش قیمت زندگی گنوا بیٹھتا ہے۔ ہم یہاں ان اسباب کا کھوج لگائیں گے اور جہاں جہاں ضرورت ہوگی ان کے دور کرنے کی تدابیر کی طرف بھی اشارے کرتے جائیں گے۔

(۱) اعلیٰ کو چھوڑ کر ادنیٰ کے اختیار کرنے کی ایک بڑی وجہ تو یہ ہے کہ عموماً لوگ وقت کی قدر و قیمت نہیں پہچانتے۔ انہیں یہ پتہ نہیں ہے کہ انسان کے ہاتھ میں اصلی دولت وقت ہی ہے، جس نے وقت کو ضائع کر دیا اس نے سب کچھ ضائع کر دیا۔ قدرت نے انسان کے ہر لمحۂ زندگی کے ساتھ ایک اہم فرض باندھ رکھا ہے جس کی ادائیگی ہی میں اس کی زندگی کی ساری عظمتیں پوشیدہ ہیں۔ اگر وہ اپنی زندگی کے کسی لمحہ میں بھی اس فرض کو پہچاننے یا ادا کرنے میں کوتاہی کر جائے جو اس لمحہ کے ساتھ مخصوص ہے تو پھر اس فرض کا وقت زندگی میں کبھی بھی نہیں آتا، کیونکہ اس کے بعد اس کو زندگی کے جو لمحات بھی میسر ہوتے ہیں وہ اپنے فرائض اور اپنی ذمہ داریاں ساتھ لاتے ہیں۔ اس وجہ سے جو فرض رہ گیا وہ گویا ہمیشہ کے لیے رہ گیا۔ اگر اس کو اس کے اصلی وقت کے بعد پورا کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ اسی کے مساوی یا اس سے بھی زیادہ بھاری دوسرے کسی فرض کو اس کی خاطر نظر انداز کیا جائے۔ جس نے یہ کہا ہے کہ

یک لمحہ غافل بودم صد سالہ راہم دور شد

اس نے محض ایک شاعرانہ خیال ہی نہیں ظاہر کیا ہے بلکہ زندگی کی ایک نہایت اہم حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے۔

وقت ایک گراں مایہ دولت ہے اور اس دولت کی فطرت یہ ہے کہ یہ رکھ چھوڑنے کی چیز نہیں ہے۔ یہ برف کے تودے کی طرح ہر وقت پگھلتی رہتی ہے، اگر انسان اس سے پوری مستعدی کے ساتھ فائدہ نہ اٹھائے تو یہ بہت جلد پانی کی روانی کے ساتھ بہہ جاتی ہے اور انسان اپنی غفلت اور بدبختی پر ہاتھ ملتا رہ جاتا ہے۔ پھر اس کی یہ بھی فطرت ہے کہ یہ ایک شمشیر دو دم ہے جس کی کاٹ دو طرفہ ہے۔ اگر آپ اس کو اپنے حق میں استعمال نہ کر سکے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ آپ کے خلاف استعمال ہوا۔ اگر اس کے ایک ایک لمحہ کے بدلہ میں آپ نے اجر نہیں کمایا تو صرف یہی خسارہ نہیں ہوا کہ آپ نے اپنے سرمایہ سے فائدہ نہیں اٹھایا

بلکہ اس کا اصلی دردانگیز پہلو یہ ہے کہ ضائع شدہ زندگی کا ایک ایک پل آپ کے لیے وبال بنا۔ یہ رائگاں جانے والی زندگی صرف رائگاں ہی نہیں جاتی بلکہ انسان پر ایک ابدی لعنت بن کر مسلط ہو جاتی ہے۔ سورہ والعصر میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور یہ سورہ وہ سورہ ہے جس کی نسبت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ارشاد ہے کہ اگر قرآن میں سے کچھ اور نہ اُترتا، صرف یہی سورہ اترتی تو ہمارے لیے کافی تھی۔ فرمایا۔

وَالْعَصْرِ۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔

زمانہ شاہد ہے کہ انسان گھاٹے میں ہے مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے عمل صالح کیے اور ایک دوسرے کو حق اور ثابت قدمی کی نصیحت کرتے رہے۔

یہ سورہ جہاں اوپر کے حقائق کی طرف اشارہ کر رہی ہے وہیں ایک اور باریک نکتہ کی طرف بھی اس سے رہنمائی مل رہی ہے۔ وہ یہ کہ انسان کے اس خسارہ کی وجہ یہ ہے کہ وہ وقت اور اس کے مصرف دونوں کی قیمتوں میں موازنہ نہیں کر پاتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اشرفیاں لوٹاتا ہے اور کوڑیوں پر مہر کرتا ہے، جواہرات دیتا ہے اور سنگریزے خریدتا ہے، کانٹوں کو چنتا ہے اور پھولوں کو پھینکتا ہے۔

اگر ایک انسان کے پاس ایک ہی روٹی ہو اور خود اس کو اور اس کے بچوں کو فاقہ درپیش ہو تو وہ بچوں کی روٹی کتوں کے آگے ڈالنے کی غلطی کبھی نہیں کرے گا۔ اگر ایک مسافر کے پاس پانی کی ایک ہی چھاگل ہو اور اس کو صحرا کا سفر درپیش ہو تو وہ اس پانی کو پاؤں دھونے پر کبھی ضائع نہیں کریگا بلکہ اس کا ایک ایک قطرہ اپنی زندگی بچانے کے لیے محفوظ رکھنے کی کوشش کریگا، اگر کسی کے ترکش میں ایک ہی تیر ہو اور راستہ میں اسے شیر یا بھیڑیے سے دوچار ہونے کا اندیشہ ہو تو وہ یہ حماقت کبھی نہیں کر سکتا کہ وہ اس ایک ہی تیر کو گیدڑوں اور لومڑیوں کے شکار پر ضائع کر دے بلکہ وہ اس کو اصل خطرہ کی مدافعت کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کرے گا۔ لیکن حیرت ہے کہ وہی انسان جو اپنی ایک روٹی، اپنے ایک چھاگل پانی اور اپنے ترکش کے ایک تیر کے مصرف کو متعین کرنے میں اتنا محتاط ہے جب اس کے سامنے خود اپنی زندگی

جیسی بیش قیمت چیز کے مصرف کے متعین کرنے کا سوال آتا ہے تو وہ بالکل ہی نادان بن جاتا ہے ظاہر ہے کہ ہمارے حصہ میں ایک ہی زندگی آئی ہے، کئی زندگیاں نہیں آئی ہیں۔ اسی زندگی کے بدلے میں ہم یا تو ابدی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں یا ابدی خسران۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ابدی کامیابی حاصل کرنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ یہ چیز محض خواہش کرنے سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے انسان کو قدم قدم پر مہمات سر کرنی پڑتی ہیں اور زندگی کے ہر موڑ پر معرکے جیتنے ہوتے ہیں۔ بغیر ان معرکوں کے جیتنے اور ان مہمات کو سر کیے انسان ابدی کامیابی نہیں حاصل کر سکتا۔ لیکن اس واضح حقیقت کے باوجود دنیا میں اکثریت انہی لوگوں کی ہے جو اپنی زندگیاں نہایت حقیر مقاصد پر ضائع کرتے ہیں۔ اس کی وجہ، جیسا کہ بیان ہوئی، یہی ہے کہ انہیں اس زندگی اور اس مدتِ حیات کی حقیقی قدر و قیمت معلوم نہیں ہے جو ان کے حصہ میں آئی ہے۔ نہ وہ اس کی سیال فطرت سے واقف ہیں، نہ اس کی دو طرفہ کاٹ کو جانتے ہیں اور نہ یہ جانتے ہیں کہ یہ خود تو اگرچہ عارضی اور فانی ہے لیکن وہ ایک ابدی اور لازوال زندگی کی قیمت بن سکتی ہے بشرطیکہ انسان اس کو حقیر مشغلوں میں ضائع کرنے کے بجائے اسی مصرف میں صرف کرے جس پر اس کو صرف ہونا چاہیے۔

(۲) اعلیٰ کو چھوڑ کر ادنیٰ کی طرف مائل ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان اپنے اس درجہ اور مرتبہ سے غافل ہو جاتا ہے جو قدرت نے اس کو بخشا ہے۔ انسان اس تمام کائنات کی تخلیق کا مقصد اور موضوع ہے۔ دنیا کی ساری چیزیں اس کے لیے بنائی گئی ہیں لیکن وہ ان چیزوں میں سے کسی چیز کے لیے بھی نہیں بنایا گیا ہے۔ کائنات کی ہر چیز اس کے لیے مسخر کی گئی ہے لیکن وہ کسی کے لیے بھی مسخر نہیں کیا گیا ہے۔ وہ ہر چیز کو استعمال کرتا ہے اور کر سکتا ہے لیکن اس دنیا میں کسی کا بھی یہ درجہ اور مرتبہ نہیں ہے کہ خود اس کو استعمال کر سکے۔ سب کے لیے فنا ہے لیکن انسان فنا ہو کر بھی باقی رہنے والا ہے۔ اس کی صلاحیتیں اور قابلیتیں غیر محدود ہیں اور اس کے درجہ کی بلندی کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس کو اپنی معرفت حاصل ہو جائے اور وہ اپنی صلاحیتوں کو صحیح طور پر استعمال کر سکے تو دوسری مخلوقات تو درکنار فرشتے بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یہ زمین میں خدا کا خلیفہ اور اس کا نائب ہے

اور خدا کے سوا کوئی بھی اس سے بڑا نہیں ہے۔ یہ مرتبہ ایک ایسا اونچا مرتبہ ہے کہ اس سے زیادہ اونچے مرتبہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ خدا نے اس مرتبہ کا انسان کے اندر شعور بھی ودیعت کیا ہے اور اس مرتبہ کی انتہائی بلندیوں تک پہنچنے کے لیے اس کو قوتیں اور قابلیتیں بھی عطا فرمائی ہیں۔ اگرچہ اپنے اس شعور کو زندہ رکھنا یا نہ رکھنا اور ان قوتوں اور قابلیتوں کو استعمال کرنا یا نہ کرنا خود اس کی اپنی آزادی رائے اور اپنی پسند یا ناپسند پر منحصر ہے۔ اور یہ اختیار و آزادی بھی غور کیجیے تو اس کے عزت و شرف ہی کا ایک پہلو ہے۔ کیونکہ خدا نے اپنی مخلوقات میں سے انسان ہی کو اس شرف سے نوازا ہے کہ وہ اپنی راہ اور منزل خود انتخاب کر سکتا ہے۔ اگر وہ اپنے اس انتخاب میں اپنے منصب اور مرتبہ کا لحاظ رکھتا ہے تو جس فطرت شاہینی کے ساتھ خدا نے اس کو پیدا کیا ہے وہ ظہور میں آتی ہے۔ لیکن اگر وہ اپنے مرتبہ اور مقام کو بھول جائے تو پھر وہ شاہین ہو کر کنجشکِ فرومایہ اور شیر ہو کر گربۂ مسکین کی فطرت اختیار کر لیتا ہے۔ قرآن مجید نے اسی حقیقت کی طرف سورۂ والتین میں اشارہ فرمایا ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ

ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا، پھر اس کو اسفل سافلین کی طرف لوٹا دیا، مگر وہ لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں جنہوں نے ایمان اور عمل صالح کی راہ اختیار کی۔

اس احساس شرف سے محروم ہو جانے کے بعد انسان جس طرح گرتا ہے اور اپنے آپ کو اپنی حقیر و ذلیل خواہشوں کے جس طرح حوالہ کر دیتا ہے اور پھر اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر وہ جس درجہ ذلیل و خوار ہوتا ہے اس کی پوری تصویر قرآن مجید نے اعراف کی اس آیت میں کھینچ کے رکھ دی ہے۔

وَاتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ الَّذِیْٓ اٰتَیْنٰهُ اٰیٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّیْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِیْنَ ۔ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَی الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَیْهِ یَلْهَثْ اَوْ

ان لوگوں کو اس شخص کی سرگذشت سناؤ جس کو ہم نے اپنی آیتوں سے نوازا تو اس نے یہ خلعت اتار پھینکی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیطان اس کے درپے ہو گیا اور وہ گمراہوں میں سے بن گیا۔ اگر ہم چاہتے تو اس کو ان آیتوں کے ذریعہ سے اٹھاتے لیکن وہ پستی ہی کی طرف مائل اور اپنی خواہشوں ہی کے

اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ۔

پیچھے پڑا رہا۔ تو اس کی شان کتے کی ہو گئی کہ اگر اس کو دھتکارو جب بھی زبان نکالے رہتا ہے اور اگر اس کے حال پر چھوڑ دو جب بھی زبان نکالے ہی رہتا ہے۔

(۳) اس کی تیسری وجہ یہ ہے کہ جتنے کام بھی اعلیٰ و اشرف ہیں وہ مشقت طلب، صبر آزما اور عموماً کڑوے کسیلے ہیں۔ ان کو انجام دینے کے لیے انسان کو ایک چڑھائی سی چڑھنی پڑتی ہے۔ برعکس اس کے گھٹیا قسم کے جو کام ہوتے ہیں وہ نہایت سہل، بے مشقت، اور نفسانی تقاضوں کو فوری تسکین بہم پہنچانے والے ہوتے ہیں، ان کے لیے انسان کو کوئی چڑھائی چڑھنے کے بجائے صرف نیچے کی طرف لڑھک جانا ہوتا ہے۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ نماز اور تلاوت کے مقابلہ میں گپ شپ کرنا، مطالعہ کرنے کے بجائے سو رہنا، فلسفہ پڑھنے کے بجائے ناول اور افسانے پڑھنا، ضبط نفس اور تربیت و تزکیہ کا درد سر مول لینے کے بجائے اپنے آپ کو خواہشات نفس کی رو پر چھوڑ دینا عام آدمیوں کے لیے نہایت سہل اور لذیذ کام ہیں۔ میدان میں ڈٹ کر لڑنے کے بجائے اگر فرار اختیار کرنا ہو اور موجوں اور باد مخالف سے نبرد آزمائی کی جگہ اگر کشتی کو موجوں ہی کے حوالہ کر دینا ہو تو آخر اس کے لیے ہاتھ پاؤں ڈھیلے کر دینے کے سوا اور کس سلیقہ یا محنت کی ضرورت ہے؟ اعلیٰ کاموں کے مقابل میں ادنیٰ کاموں کی یہی فطرت ہے جو ان لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے جو اپنے اندر ہمت اور اولوالعزمی نہیں رکھتے اور جو محنت و مشقت کے بجائے کاہلی اور سہل پسندی کی زندگی گذارنا چاہتے ہیں۔ اعلیٰ اور ادنیٰ کے اسی فرق کو ایک حدیث نبویؐ میں اس طرح واضح فرمایا گیا ہے کہ حفت الجنة بالمکارہ وحفت الجنة بالشهوات جس کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ کمال کی منزل مشکلات و مصائب سے گھری ہوئی ہے اور اہلِ خسران کی منزل خواہشاتِ نفس سے گھری ہوئی ہے۔ اگر کوئی شخص جنت حاصل کرنا چاہے تو اس کو بے شمار مشکلات و مصائب سے لڑنا اور ان پر غالب آنا پڑیگا، برعکس اس کے اگر کوئی شخص دوزخ میں گرنا چاہے تو اس کا معاملہ نہایت سہل ہے، وہ کسی مزاحمت کا مقابلہ کیے بغیر، اپنی خواہشات کے سبز باغوں میں پھرتا پھراتا وہاں تک پہنچ جاتا ہے۔ نیکی اور بدی کے مزاج کا یہی اختلاف ہے جس کے سبب سے انسان نیکی کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتا ہے

کیونکہ اس راہ میں اس کو گھاٹیاں پار کرنی پڑتی ہیں اور قدم قدم پر اپنے نفس کی خواہشوں سے لڑنا ہوتا ہے۔ چنانچہ خود قرآن نے اس راہ کے سفر کو "اقتحام عقبہ" سے تعبیر کیا ہے جس کے معنی ہیں گھاٹی کو پار کرنا۔ فرمایا ہے۔

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ وَمَا أَدْرٰكَ مَا الْعَقَبَةُ فَكُّ رَقَبَةٍ أَوْ إِطْعٰمٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ أَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ أُولٰئِكَ أَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ (سورہ بلد)

اور ہم نے اس کے لیے بدی اور نیکی دونوں کی راہیں کھولیں تو اس نے گھاٹی کو پار نہیں کیا۔ اور تم کیا سمجھے کہ گھاٹی کیا ہے؟ غلام کو آزاد کرنا یا بھوک کے دن کسی قرابت مند یتیم یا کسی خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا۔ علاوہ ازیں ان لوگوں کے زمرہ میں سے بننا جو ایمان لائے اور جو ایک دوسرے کو صبر اور ہمدردی کی نصیحت کرتے رہے۔ یہی لوگ ہیں جو آخرت میں خوش نصیب ہوں گے۔

برعکس اس کے جو شخص بدی کے گڑھے میں گرنا چاہتا ہے وہ اپنی منزل بڑی تیزی سے طے کرتا ہے۔ وہ بدی کا رخ کرتے ہی خود بخود لڑھکتا ہوا اپنے پسند کردہ قعرِ مذلت کی گہرائیوں میں پہنچ جاتا ہے اس کا اشارہ ثم رددنٰہ اسفل سافلین میں "سافلین" کے لفظ سے نکل رہا ہے۔ اس کا اصل مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خواہشاتِ نفس کے پیرو کو اس کی خواہشات کے حوالہ کر دیتا ہے اور وہ لڑھکتا ہوا اخلاقی پستی کی آخری حدوں تک پہنچ جاتا ہے۔

اس موقع پر نفس انسانی کی اس خصوصیت کو بھی نگاہ میں رکھنا چاہیے جس کی طرف حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اشارہ فرمایا ہے۔ انہوں نے حضرت عمرؓ کو خلافت کی ذمہ داریاں سپرد کرتے وقت جو قیمتی نصیحتیں فرمائیں ان میں ایک نصیحت یہ بھی تھی کہ اس بات کو یاد رکھنا کہ نفس کی یہ خصوصیت ہے کہ اگر اس کی ایک ناجائز خواہش پوری کر دی جائے تو پھر وہ دوسری کے لیے ہاتھ پاؤں پھیلاتا ہے۔ یعنی ایک کمزوری دوسری کمزوری کے لیے اور ایک برائی دوسری برائی کے لیے خود راہ کھول دیتی ہے اس وجہ سے بہتری اسی میں ہے کہ نفس کو اس جانب ڈھیل ہی نہ دی جائے، ورنہ اگر ایک مرتبہ وہ اس راہ پر چل پڑا تو پھر اس کو

اس سے موڑنا آسان نہیں رہے گا، ایک چراگاہ کے بعد دوسری چراگاہ اس کے سامنے آتی رہے گی اور وہ آگے ہی بڑھتا چلا جائے گا، یہاں تک کہ وہاں پہنچ جائے گا جہاں پہنچ کر واپس آنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

(۴) اعلیٰ کے مقابل میں ادنیٰ کو ترجیح دینے کی ایک بڑی وجہ دنیا میں ادنیٰ پرستوں کی کثرت بھی ہے۔ آدمی اسی راہ پر چلنے میں سلامتی دیکھتا ہے جو قافلوں سے بھری ہوئی ہو۔ جس کام کو اکثریت کر رہی ہو اس کے کرنے کے لیے صرف یہی نہیں کہ دل میں تحریک اٹھتی ہے بلکہ یہ چیز اس کے ایک اعلیٰ اور عمدہ کام ہونے کی ایک نہایت قوی دلیل بھی بن جاتی ہے تاریخ کے جس دور میں جس چیز کا بھی زور ہوا ہے اس نے وبائے عام کی طرح ہر شخص کو کچھ نہ کچھ ضرور متاثر کیا ہے اور اس تاثر میں اصل تو اس کی واقعی قدر و قیمت پر بہت کم لوگوں نے غور ہی کیا۔ اور اگر کچھ لوگوں نے غور بھی کیا تو بالآخر انہیں بھی وقت کی عام بدمذاقی کے آگے سپر ڈال دینی پڑی۔ بنی اسرائیل کے بگاڑ کی تاریخ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح بیان فرمائی ہے کہ جب ان کے اندر خرابیاں پھیلنی شروع ہوئیں تو ابتدا میں ان کے علماء نے ان کو ان سے روکنا چاہا لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ وقت کے رجحانِ عام کے آگے ان کے لیے بند باندھنا مشکل ہے تو وہ خود بھی اسی رجحانِ عام کی رو میں بہنے کے لیے تیار ہو گئے جس کی سزا ان کو یہ ملی کہ اللہ تعالیٰ نے بگڑے ہوئے لوگوں کے دلوں کی سیاہی ان کے دلوں پر بھی تھوپ دی۔ خود ہماری اپنی تاریخ پر بھی غور کیجیے تو کچھ یہی صورتِ حال یہاں بھی نظر آئے گی۔ صدرِ اول کو چھوڑ کر جس میں زندگی کے ہر شعبہ میں اعلیٰ اقدار کا حقیقی احترام باقی رہا، بعد کے ادوار کو دیکھیے تو جو چیز بھی ذہنوں اور دماغوں پر چھا گئی ہے اسی کا کلمہ سب پڑھنے لگے ہیں۔ جس دور میں شعر و ادب کا زور ہوا سب اسی رنگ میں مست نظر آنے لگے، جب یونانی علوم کی گرم بازاری ہوئی تو ان علوم کے آگے سارے علوم ہیچ ہو گئے، یہاں تک کہ ان کے اعزاز و احترام میں کتاب و سنت کی بساط بھی لپیٹ کر رکھ دی گئی۔ اسی طرح جب تصوف کا چرچا پھیلا تو کتاب و سنت کی تعبیریں بھی اسی کی روشنی میں کی جانے لگیں، گویا یہ اصل ہے اور کتاب و سنت اس کی فرع ہیں۔ اب اس زمانہ میں دیکھیے تو مغربی علوم و فنون نے ہر شخص کو اس طرح مسحور کر لیا ہے کہ کسی کو ہوش ہی نہیں کہ ان کے سوا کوئی اور علم بھی ہے جس کے سیکھنے سکھانے کی ضرورت ہے اور زندگی میں اس کی بھی

کوئی قدر وقیمت ہے۔ حالانکہ ہر چیز میں حق و باطل کے درمیان امتیاز کی کسوٹی ہے وہی ہے جس کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس کے بغیر تو یہ سارے علوم و فنون انسانیت کے حقیقی فائدہ کے نقطۂ نظر سے ضرر ناک زیادہ اور مفید بہت کم رہ جاتے ہیں۔ لیکن ہماری تاریخ میں بہت تھوڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جنہوں نے اس ہمہ گیر فتنہ کے اندر اپنے ذہنی توازن کو قائم رکھا اور جو نہ تو زمانہ کا ساتھ دیتے ہوئے اتنے عاجز اور بے بس ہوئے کہ وہ وقت کے سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں اور نہ اتنے جامد ثابت ہوئے کہ سیلاب ان کے اوپر سے گذر جائے اور وہ اپنی جگہ ہی پہ پتھر کی طرح پڑے رہ جائیں۔ در حقیقت یہی گنتی کے افراد ہیں جنہوں نے تمام طوفانوں اور تھپیڑوں کے اندر امت کے سفینہ کی ناخدائی کی ہے اور اس کو غرق ہونے سے بچایا جا سکے۔ اگر یہ نہ ہوتے تو آج ہمارے لیے یہ معلوم کرنا بھی مشکل ہوتا کہ ہماری تاریخ کہاں سے شروع ہوئی اور کہاں پہ جا کر ختم ہوئی۔ ہم صحرا میں ایک کھوئے ہوئے قافلہ کی مانند ہوتے جسے کچھ پتہ نہیں کہ کدھر سے آئے ہیں اور کدھر جانا ہے۔

اعلیٰ کو چھوڑ کر ادنیٰ کے اختیار کرنے کے ان چاروں اسباب پر نگاہ ڈالیے تو ان کی تہ میں یا تو شعور کی کمی نظر آئے گی یا ہمت کی۔ جو لوگ وقت اور زندگی کی ناقدری کے سبب سے یہ روش اختیار کر لیتے ہیں ان کے اندر شعور اور بیداری کا فقدان ہے اور جو لوگ مشکلات کا یا ہمہ گیر بگاڑ سے مرعوب ہو کر دنیائے عام میں مرنے پہ آمادہ ہو جاتے ہیں ان کے اندر عزم اور یقین ناپید ہے۔ شعور کو بیدار رکھنے کے لیے سب سے زیادہ مفید چیز صالح لٹریچر کا مطالعہ اور ذی شعور لوگوں کی صحبت ہے۔ آدمی کو برابر ایسی چیزیں پڑھتے رہنا چاہیے جن میں زندگی کی حقیقتوں سے پردہ اٹھایا گیا ہے، جو دل کو بیدار کرنے والی اور کانوں اور آنکھوں کو کھولنے والی ہیں، جو عقل کو جلا دیتی اور روح کو گرماتی ہیں، جن سے ایمان کی غذا ملتی ہے اور اس عالم فانی کی جگہ عالم باقی کی محبت پیدا ہوتی ہے، جن کے اندر معرفت کا نور اور علم حقیقی کی روشنی ہے۔ ایسی چیزوں میں سب سے اونچا درجہ کتاب اللہ اور احادیث رسول کا ہے۔ ان کے حرف حرف اور سطر سطر کے اندر خالص حقیقت اور بالکل بے آمیز علم ہے۔ ان کے بعد زبور اور انجیل، امثال سلیمان اور صالحین و مصلحین امت کی لکھی ہوئی چیزیں ہیں یا پھر ایسے حکیموں اور فلسفیوں

کی چیزیں ہیں جنہوں نے فی الواقع زندگی کے مسائل پر غور کیا ہے اور اس کے حقائق سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ ان چیزوں کے اندر کچھ ملاوٹیں اور آمیزشیں بھی ہیں اور جگہ جگہ ان میں فکر انسانی کی غلطیاں بھی پائی جاتی ہیں لیکن جو لوگ ان کو قرآن و حدیث کی روشنی میں پڑھتے ہیں وہ نہایت آسانی سے ان کے حق و باطل میں خود امتیاز کر لیتے ہیں۔

ہمت اور عزیمت پیدا کرنے کے لیے جو چیزیں ضروری ہیں ان میں سے اکثر تو ایسی ہیں جن کا تعلق عمل سے ہے اور ہم ان کی تفصیل آگے چل کر تزکیۂ عمل کے باب میں کریں گے۔ یہاں جس بات کا بتانا مناسب اور ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ایک حقیقت کو جیسی کچھ بھی وہ ہو پہلے آدمی کو وہ ٹھیک ٹھیک سمجھ لینی چاہیے ایک حقیقت کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لینا ان تیاریوں میں بہت معین ہوا کرتا ہے جو آدمی کو اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کرنی پڑتی ہیں۔

اس میں ذرا بھی شبہ نہیں ہے کہ جتنی بھی اعلیٰ قدریں ہیں وہ فطرت کو محبوب ہونے کے باوجود ہمیشہ عزم، ہمت طلب اور صبر آزما ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں ان کے چاہنے والے تو ہمیشہ زیادہ رہے ہیں لیکن عملاً ان کے اختیار کرنے والے ہمیشہ تھوڑے ہی نکلے۔ ان کی خوبیوں اور برکتوں کے گن تو بزدلوں اور پست ہمتوں نے بھی گائے لیکن ان کے حاصل کرنے کے لیے جن قربانیوں کی ضرورت تھی ان کے پیش کرنے والوں کی تعداد ہمیشہ کم ہی رہی۔ اس صورتِ حال کی وضاحت اس راہ کے داعیوں نے ہمیشہ خود ہی کر دی ہے تاکہ وہی لوگ اس میں قدم رکھیں جو اس کی مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اپنے اندر کچھ دم خم رکھتے ہیں، جو لوگ اس وادیٔ پُرخار کی صعوبتوں کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ ہی نہیں رکھتے بہتر ہے کہ وہ اس کا رخ ہی نہ کریں۔ ؎

جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں؟

حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ "نیکی کی راہ تنگ ہے اور اس کے چلنے والے تھوڑے ہیں اور بدی کا راستہ فراخ ہے اور اس کے چلنے والے بہت ہیں"

اسی حقیقت کو قرآن نے اپنے الفاظ میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا — کیا لوگوں نے گمان کر رکھا ہے کہ وہ محض یہ کہنے پر چھوڑ

آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ۔ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَ لَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ ۔ (عنکبوت - ۲-۳)	دیئے جائیں گے کہ "ہم ایمان لائے" اور ان کی جانچ نہیں ہوگی؟ حالانکہ ہم نے ان لوگوں کو جانچا جو ان سے پہلے گزرے تو اللہ ضرور ممیز کرے گا ان لوگوں کو جنہوں نے سچ کہا اور ان لوگوں کو جو جھوٹے ہیں۔

قرآن مجید نے اس حقیقت کو بھی نہایت واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے کہ اس دنیا میں اگرچہ خبیث اور خباثت پسندوں کی اکثریت ہے اور یہ اکثریت کمزوردل اور پست ہمتوں کو خباثت پسندی پر اکسا بھی دیتی ہے لیکن خدا کی میزان میں بہرحال وزن طیب ہی کا ہے اور فلاح پانے والے وہی ہونگے جو خبیث کی اس کثرت سے مرعوب نہ ہوں بلکہ طیب کو اختیار کریں اگرچہ یہ خود بھی کم ہو اور اس کے لیے بازیاں کھیلنے والے بھی کم ہی ہوں۔

قُلْ لَا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيثِ فَاتَّقُوا اللَّهَ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ ۔ (مائدہ - ۱۰۰)	کہہ دو خدا کی میزان میں خبیث اور طیب برابر نہیں ہونگے اگرچہ خبیث کی کثرت تم کو کتنا ہی فریفتہ کیوں نہ کرے۔ تو اللہ سے ڈرتے رہو اے عقل رکھنے والو۔

ان تنبیہات کا مقصد یہ ہے کہ ہر شخص حقیقت کو جیسی کچھ وہ ہے، اچھی طرح سمجھ لے۔ کوئی شخص اس غلط فہمی میں مبتلا نہ رہے کہ ادنیٰ کے مقابل میں اعلیٰ کی طلب کوئی آسان بازی ہے جس کو ہر شخص کھیل سکتا ہے۔ اس میں تو شبہ نہیں ہے کہ چاہنے کی چیز اگر کوئی ہے تو یہی ہے، کرنے کا کام کوئی ہے تو یہی ہے، کامیابی اور فلاح کی راہ ہے تو یہی ہے، انسان کے شرف اور عزت کے مطابق، اور اس کے مرتبہ اور درجہ کے شایان شان کوئی چیز ہے تو یہی ہے۔ لیکن اس میں بھی شبہ نہیں ہے کہ اس راہ کے خطرات کا مقابلہ کرنا اور اس کی مشکلات سے عہدہ برآ ہونا ہر بوالہوس اور ہر مدعی کا کام نہیں ہے۔ اس میں کامیابی انہی کو حاصل ہو سکتی ہے جو ایک عاشق صادق کا جنون اور ایک مرد مجاہد کا عزم و حوصلہ رکھتے ہوں۔

اس صورت حال کو سمجھ لینا اس لیے بھی ضروری ہے کہ آدمی جس کام کے لیے اٹھے اگر اس کے تقاضوں اور اسکے نتائج سے پوری طرح باخبر ہو اور اس کے لیے اپنے عزم و ارادہ کو اچھی طرح تول کے اٹھے تو مشکلات سے لڑنے اور ان پر قابو پانے کی صلاحیت اس کے اندر بہت بڑھ جاتی ہے۔ لیکن اگر اس طرح کے کسی معرکہ کے

لیے وہ بالکل بے خبر نہ اٹھ کھڑا ہو تو پہلی ہی چوٹ میں وہ ہمت ہار بیٹھتا ہے۔ اگر ایک شخص شیر کے شکار کے ارادہ سے نکلے اور اس کو شیر سے سابقہ پیش آجائے تو وہ خطرات میں اپنے حواس بجا رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور بسا اوقات اس میں وہ کامیاب بھی ہو جاتا ہے لیکن اگر کوئی شخص گیدڑ شکار کے لیے نکلے اور اس کو سابقہ پیش آجائے شیر سے تو وہ کس طرح اپنے اوسان قائم رکھ سکتا ہے۔

اس حقیقت نفس الامری سے کما حقہٗ واقفیت کے علاوہ دوسری چیز جو آدمی میں عزم و ہمت پیدا کرتی ہے۔ وہ مردانِ حق کی معیت و رفاقت ہے۔ یہ معیت و رفاقت ذہنی طور پر بھی حاصل کی جاتی ہے اور عملی طور پر بھی۔ ذہنی طور پر اس کے حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان لوگوں کی سیرتوں کا برابر مطالعہ کیا جاتا رہے جنہوں نے راہِ حق میں مصیبتیں جھیلی ہیں۔ جنہوں نے اعلیٰ اقتدار کی طلب میں دنیا کی جھوٹی عزتوں اور شہرتوں کو نہایت حقارت سے ٹھکرایا ہے جو نیکی اور سچائی کی راہ پر چلنے کے لیے یکہ و تنہا اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، اور اپنے عزم و حوصلہ سے انہوں نے دوسروں کے لیے اس راہ پر چلنا آسان کر دیا ہے، جنہوں نے جہل کی ظلمت میں علم کے دیئے جلائے ہیں اور ان کو بادِ حوادث سے محفوظ رکھا ہے، جنہوں نے باطل کے غوغائے عام میں حق کا نعرہ مستانہ بلند کیا اور پھر یا تو باطل کو مغلوب کر لیا ہے یا اس سے لڑتے لڑتے شہید ہو گئے ہیں اور اپنے بعد آنے والوں کے لیے اپنا نقشِ قدم ایک نشانِ ہمت کی حیثیت سے یادگار چھوڑا ہے۔ ایسے لوگوں کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ آدمی کے اندر ہمت پیدا بھی کرتا اور پیدا شدہ ہمت کو برقرار بھی رکھتا ہے۔

عملی طور پر اس چیز کو حاصل کرنے کے لیے آدمی کو ایسے لوگوں کی جستجو کرنی پڑتی ہے جو اس راہ میں اس کی رہنمائی کر سکیں۔ اور اگر رہنمائی نہ کر سکیں تو کم از کم رفاقت ہی کا حق ادا کر سکیں۔ یہ دنیا جب تک قائم ہے اس میں جس طرح بُرے لوگ موجود رہیں گے اسی طرح اچھے لوگ بھی موجود رہیں گے۔ اگر بُروں کو لیڈر بھی مل جاتے ہیں اور ساتھی بھی میسر آجاتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایک خیر کے طالب کو ساتھی اور رہنما نہ مل سکیں شرط صرف یہ ہے کہ آدمی خلوص کے ساتھ تلاش کرے اور جب پا جائے تو ان کی معیت و رفاقت کے حاصل کرنے کے لیے ہر قیمت دینے پر تیار ہو جائے۔ یہاں تک کہ اگر اس کے لیے آدمی کو گھر بار اور ملک و وطن بھی چھوڑنا پڑ جائے تو یہ بازی بھی وہ جی کڑا کر کے کھیل ہی ڈالے۔ یہ خدا کی راہ میں اس کی ہجرت ہو گی اور اس ہجرت کی راہ آدمی

کے لیے ہمیشہ کھلی ہوئی ہے۔ ہجرت کا اصلی مقصد ہمیشہ یہی رہا ہے کہ ایک اعلیٰ نصب العین کی خاطر ایک ناسازگار ماحول کو چھوڑ کر ایک سازگار ماحول تلاش کیا جائے۔ یہ ماحول زندگی کے بناؤ اور بگاڑ میں بڑا مؤثر عامل ہے جس کو کسی حال میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ماحول ناسازگار ہو، تو بسا اوقات بڑی اعلیٰ صلاحیتیں بھی برباد ہو کے رہ جاتی ہیں۔ اور اگر ماحول سازگار مل جائے تو معمولی صلاحیتیں بھی جلا پاکر ذرہ سے آفتاب بن جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انبیائے کرام تک کا حال یہ رہا ہے کہ انہوں اچھے ماحول اور اچھے ساتھیوں کے لیے دعائیں کی ہیں اور ان کے حاصل کرنے کے لیے بڑی بڑی بازیاں کھیلی ہیں۔ حالانکہ انبیاء علیہم السلام اپنی عزیمت و استقامت کے اعتبار سے بجائے خود ایک عالم رہے ہیں، انہوں نے دوسروں کو اپنی حرارت سے گرمی پہنچائی ہے کبھی دوسروں سے حرارت حاصل کرنے کے محتاج نہیں ہوئے اور . . . .

. . . . . . اپنی ذات سے اپنے ماحول کو روشن کیا ہے، کبھی ماحول سے روشنی حاصل کرنے کی ان کو ضرورت نہیں پیش آئی ہے۔

اس میں شبہ نہیں ہے کہ آدمی کی صلاحیت اگر قوی ہو تو بسا اوقات وہ تاریکی سے بھی روشنی حاصل کر لیتا ہے اور راہ کی ٹھوکروں سے بھی اس کو رہنمائی مل جاتی ہے۔ علامہ احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ابوالہیثم نامی ایک چور کے لیے اکثر دعائے خیر فرماتے رہتے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ ایک چور کے لیے دعائے خیر کیوں فرماتے ہیں تو انہوں نے فرمایا کہ میرے ابتلا کے زمانہ میں اس نے اپنے عملی نمونہ سے مجھے نہایت قیمتی درس دیا تھا، جب مجھے بیڑیوں میں جکڑ کر اور اونٹ پر سوار کر کے لے جایا جا رہا تھا تو یہ شخص ایک جگہ راہ میں مجھے ملا اور اس نے مجھ سے کہا کہ ابن حنبل، چوری کے جرم میں مجھے اتنی بار قید و بند کی مصیبتیں جھیلنی پڑی ہیں اور اتنے سو دُرّے میری پیٹھ پر پڑے ہیں تاہم میں اپنی حرکت سے باز نہیں آیا، اگر میں شیطان کی راہ میں یہ مصائب جھیل کر اس طرح استوار رہ سکتا ہوں تو حیف ہے اگر تم خدا کی راہ میں ان مصائب کو پامردی سے نہ برداشت کر سکو۔ حضرت امام فرماتے ہیں کہ اس کی اس جرأت و صلابت سے مجھے بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ اسی طرح جو لوگ اپنے اندر اعلیٰ صلاحیتیں رکھتے ہیں ان سے یہ توقع بعید نہیں ہے کہ وہ ان جانبازیوں سے راہ حق کے لیے درس حاصل کریں جو آج باطل کے علم بردار

باطل کو سر بلند کرنے کے لیے دکھا رہے ہیں لیکن ایسے غیر معمولی عزم و حوصلہ کے لوگ زیادہ نہیں ہو سکتے۔ زیادہ لوگ تو ایسے ہی ہو سکتے ہیں جن کو اچھے ساتھی ملیں تو وہ اچھے بن سکتے ہیں۔ لیکن اگر بُرے ساتھی مل جائیں تو اندیشہ ہے کہ اُن کی بُرائیاں ان پر بھی غالب آجائیں۔ اس وجہ سے انسان کی عام فطرت کے لحاظ سے یہ ضروری ہے کہ جو لوگ اپنی خوبیوں کو پروان چڑھانا چاہتے ہوں وہ سازگار ماحول اور اچھے ساتھیوں کی تلاش سے غافل نہ رہیں۔

آخری چیز جو اس مقصد کے لیے اکسیر کا حکم رکھتی ہے وہ بندے کا اللہ کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ اگر دل کا سفینہ اس لنگر کے ساتھ بندھا ہوا ہو تو خواہ کیسی ہی بادِ مخالف چلے اور کیسی ہی خطرناک موجیں اٹھیں لیکن کشتی ہچکولے کھا کر بھی سلامت رہتی ہے اور طوفانوں کے اندر سے گزرتی ہوئی ساحلِ مراد پر پہنچ ہی جاتی ہے۔ رہنما غلطی کر سکتے ہیں اور رفقاء ساتھ چھوڑ سکتے ہیں لیکن خدا کبھی ان لوگوں کو نہیں چھوڑتا جو ہر حال اور ہر صورت خدا کو پکڑے رہنا چاہتے ہیں۔ اس نے خود فرمایا ہے کہ جو لوگ میری راہ پر چلنا چاہتے ہیں اور اس راہ کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں میں ان کے لیے مشکلات کے اندر سے راہ پیدا کرتا ہوں۔ مَنْ جَاهَدَ فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ اور اسی کے ساتھ اس نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ جو لوگ اس راہ کی مشکلات کے مقابل میں ثابت قدم رہنا چاہتے ہیں تو یہ چیز ان کو اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے جب وہ میرے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط و استوار رکھیں اور میری یاد سے کبھی غافل نہ ہوں۔ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ اور تم ثابت قدمی نہیں حاصل کر سکتے مگر اللہ کے تعلق سے۔

محسنِ انسانیت (صلی اللہ علیہ وسلم)

(مخالفتوں سے گذرتے ہوئے)

مدنی دور

(بہ سلسلۂ گذشتہ)

طوفان امڈ پڑا تحریکِ اسلامی کے دورِ اوائل میں یہود بہت سے ایسے پہلو دیکھ رہے تھے جن کی بنا پر ان کو آس لگی رہی کہ آہستہ آہستہ یہ تاریخی طاقت ہمارے ہاتھ میں آجائیگی۔ قرآن میں بنی اسرائیل کی بہاتی فضیلت کا ذکر تھا۔ اِنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ـــــ ، ان کے انبیاء کی نبوت کی تصدیق تھی، ان کی کتابِ مقدس کی حقانیت کی گواہی تھی، ان کے سامنے تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَاءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ کی اسپرٹ سے دین کی مرکزی حقیقت کو اجاگر کیا جا رہا تھا۔ حضور سرورِ عالم مشرکین کے طور طریقوں کے مقابلے میں یہود کے بعض طریقوں کو پسند فرماتے، مثلاً مشرکین بالوں میں مانگ نکالتے تھے اور یہود نہیں نکالتے تھے، سو آپ نے اس معاملے میں مشرکین کی مخالفت کی اور یہود کی موافقت! جن معاملات میں قرآن میں کوئی حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے وارد نہیں ہوتا تھا ان میں نبیؐ اکرم بالعموم اہلِ کتاب کی موافقت کرتے[1] مدینہ کے یہودی عاشورا کے دن کا روزہ رکھتے تھے، آپ نے بھی اس دن روزہ رکھا اور مسلمانوں کے لیے عاشورا کا روزہ رکھنا پسند فرمایا۔ کسی یہودی کا جنازہ گذرتا تو آپ کھڑے ہو جاتے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلمانوں کے لیے قبلۂ نماز بیت المقدس تھا۔ یہ ایک کھلی ہوئی علامت تھی کہ تحریکِ اسلامی مشرکین کے مقابلے میں اہلِ کتاب سے زیادہ اقرب تھی۔ امرِ واقعہ در حقیقت یہ تھا کہ یہودیت کا قالب تو اس مذہب کے مفاد پرست مولویوں اور پیروں نے پوری طرح مسخ کر ڈالا تھا، اور یہ قالب بے جان بھی ہو چکا تھا، لیکن موسیٰ علیہ السلام جس دین کو لائے تھے وہ وہی اسلام تھا جسے سارے

[1] بخاری، کتاب اللباس

یہی انبیاء نے شرائع کے تھوڑے بہت تفاوت کے ساتھ پیش کیا تھا اور اب اسی کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے سامنے رکھ رہے تھے بلکہ ایک نظام کی صورت میں برپا کر رہے تھے۔ یہی رشتہ تھا جس کی بنا پر حضور کو بھی امیدیں تھیں کہ یہود اسلامی جدوجہد کو جوں جوں سمجھیں گے، اس کا خیر مقدم کریں گے اور اس کام کو اپنا کام سمجھیں گے۔ انہیں خوشی ہوگی کہ خدا کے نام کا جھنڈا بلند ہو رہا ہے اور انبیاء کے دیئے ہوئے اصولِ اخلاق نظامِ زندگی کی بنیاد بن رہے ہیں اور شریعتِ تورات کی اصل قدروں کے بجھے ہوئے دیئے از سرِ نو روشن کیے جا رہے ہیں۔ انہی امیدوں کی فضا میں قرآن نے اپنی دعوت یوں پیش کی تھی کہ اصل سوال گروہ بندیوں کا نہیں، اصول و عمل کا ہے۔ یہودیوں میں سے، عیسائیوں میں سے، صابئیوں میں سے اور خود اسلام کے نام لیواؤں میں سے جو کوئی فی الحقیقت خدا اور اس کے قانون اور اس کے انبیاء کی دعوت اور محاسبۂ روزِ جزا پر ایمان لائے اور پھر اپنی زندگی کو عملِ صالح بنا کے دکھا دے تو بس یہ چیز ہے جو مطلوب ہے۔ اصل چیز نام نہیں، کام ہے۔ مطلوب ٹھپے نہیں، کھرا مال ہے۔ مقصود نسبتیں نہیں، سیرتیں ہیں۔ مسئلہ کسی دھڑے اور جتھے کے مفاد کا نہیں، انسانیت کی مشترک خیر و فلاح کا ہے۔ لیکن نہ یہودیوں کی طرف سے تحریکِ اسلامی کی امیدیں پوری ہوئیں، نہ تحریکِ اسلامی کی طرف سے یہودیوں کی مرادیں بر آئیں۔

اور یکایک تحریکِ اسلامی ایک انقلابی موڑ مڑ گئی۔ یہ موڑ تھا تحویلِ قبلہ کا واقعہ! تحریکِ اسلامی کی بنیادی فطرت ہر دور میں یہ رہی ہے کہ وہ اپنے امتیازی وجود کو نمایاں رکھنا چاہتی ہے اور اپنے افراد کے اندر اصولی و اعتقادی خودی کو زندہ رکھنا چاہتی ہے۔ مکہ میں اسی تقاضے کے تحت بیت المقدس کو قبلہ بنایا گیا تھا تاکہ نظریۂ اسلامی کی علمبردار جماعت کو اپنی جداگانہ حیثیت کا احساس ہو۔ چنانچہ ہجرت تک کے لمبے دور میں مسلمانوں نے مشرکین کے مقابلہ میں اپنی مختلف حیثیت کا پوری طرح احساس کر لیا اور خود مشرکین کو بھی احساس ہو گیا کہ وہ اور مسلمان دو الگ الگ سمتوں میں حرکت کرنے والی طاقتیں ہیں۔ اسی شعور و احساس کی تکمیل تھی جس کا اظہار "لکم دینکم ولی دین" کے مختصر سے قرآنی بول میں کر دیا گیا۔ بات پوری طرح نتھر گئی کہ تمہاری راہ الگ، ہمارا راستہ جدا، ہم میں تم میں کوئی جوڑ میل نہیں۔

اب مدینہ میں آ کر جو کچھ بھی اندیشۂ التباس تھا وہ اہلِ کتاب سے تھا اور اب اس امر کی ضرورت تھی

کہ تحریک اسلامی کو اہل کتاب کی بے روح مذہبیت سے ممیز رکھا جائے اور مسلم معاشرے کو یہودی معاشرے میں ذہنی طور پر تحلیل ہونے سے بچایا جائے۔ اب وہ مدبرکی وہ ضرورت ختم ہو چکی تھی جس کے تحت بیت المقدس کو عارضی طور پر قبلہ بنا لیا گیا تھا۔ مسلمانوں کا ذہنی رابطہ قبلۂ ابراہیمی ہی سے اقرب تھا اور حضورؐ خود اسی خانوادہ کے چشم و چراغ تھے اور تحریک کے اولین جانباز بھی بنو اسمٰعیل سے تعلق رکھتے تھے۔ امتیاز کا وہ عارضی اہتمام اب غیر ضروری تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حضورؐ کا قلبِ حقیقت شناس پہلے سے اس تبدیلی کا منتظر رہا، اور اس کا ذکر خود قرآن میں ہے کہ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ۔

تحویلِ قبلہ کا فرمان صادر کر کے درحقیقت سلطنتِ زندگی کے فرماں روائے حقیقی نے جہانی امامت کے منصب سے بنی اسرائیل کو معزول کر دیا اور ان کی جگہ ملتِ اسلام کو مامور فرمایا۔ عالمی دعوتِ خیر و فلاح کا جو مرکز پہلے بیت المقدس میں چلا آرہا تھا وہ اب حرمِ کعبہ کی طرف منتقل کر دیا گیا۔ مسلمانوں کو امتِ وسط یعنی عالمی دعوت کا مرکزی گروہ قرار دیا گیا جس پر شہادت علی الناس کی ذمہ داری ڈالی گئی اور تمام بنی نوعِ انسان کی رہنمائی کا فریضہ عائد کیا گیا۔

سولہ مہینے تک مدینہ میں بیت المقدس کے رُخ نماز ادا کی جاتی رہی۔ رجب یا شعبان ۲ھ کا واقعہ ہے کہ ابن سعد کی روایت کے بموجب سرورِ عالم بشر بن براء بن معرور کے ہاں دعوت پر گئے تھے۔ وہاں ظہر کا وقت آگیا اور آپ لوگوں کو نماز پڑھانے کھڑے ہوئے۔ دو رکعتیں پڑھا چکے تھے کہ تیسری رکعت میں یکایک وحی کے ذریعے یہ آیت نازل ہوئی کہ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ "یعنی ہم تمہیں اسی قبلے کی طرف پھیر دیتے ہیں جسے تم پسند کرتے ہو۔ سو (اب) مسجدِ حرام کی طرف رخ پھیر دو۔ اب جہاں کہیں بھی تم ہو، اسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرو۔"

اس حکم کے سنتے ہی خدا کا سب سے زیادہ اطاعت شعار بندہ بحالتِ نماز ہی میں رُخ بدل لیتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کا اتباع کرنے والے تمام نمازی نئے قبلہ کی طرف مُڑ جاتے ہیں۔ بیت المقدس مدینے سے سیدھا شمال میں ہے اور مکہ جنوب میں۔ حالتِ نماز میں قبلہ کی تبدیلی کے معنی یہ ہوئے کہ

امام کو مقتدیوں کے سامنے سے سیدھا پیچھے کی طرف آنا پڑا ہوگا اور نمازیوں کی صف کو بالکل الٹے قدموں گھومنا پڑا ہوگا۔ اس کے بعد مدینہ اور آس پاس کی بستیوں میں عام منادی کرا دی گئی۔ براء بن عازب کا بیان ہے کہ ایک جگہ منادی کی آواز اس حالت میں پہنچی کہ لوگ رکوع میں تھے اور وہ اعلان سنتے ہی اسی حالت میں کعبے کی طرف مڑ گئے۔ انس بن مالک کی روایت ہے کہ بنی سلمہ کے ہاں یہ اطلاع دوسرے روز نماز صبح کے دوران میں پہنچی۔ لوگ ایک رکعت پڑھ کر دوسری میں تھے کہ منادی کی پکار سنی اور اسے سنتے ہی پوری جماعت نے اپنا رُخ بدل لیا۔[1]

اس تبدیلی پر جو ہنگامہ بپا ہونے والا تھا اس کے بارے میں پہلے سے قرآن نے مسلمانوں کو آگاہ کر دیا۔ سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا۔ یعنی نادان اور حقیقت ناآشنا لوگ قیل و قال کا طوفان اٹھا دیں گے کہ ان لوگوں نے کس سبب سے قبلہ بدل ڈالا ہے۔ طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہونگی، عجیب وغریب ذہنی ردِ عمل رونما ہونگے اور تعلقات و روابط پر بُرا اثر پڑے گا۔ مسلمانوں کو پروپیگنڈے کے آنے والے طوفان میں مضبوط موقف لے کر کھڑے رہنے کے لیے قرآن نے تحویل قبلہ کی معنویت کو پیشگی ان کے ذہن نشین کرا دیا۔ انہیں بتایا کہ پہلے بیت المقدس کو قبلہ بنانے سے غرض یہ تھی کہ عربیت کے بُت کو توڑا جائے، کیونکہ عرب اپنے قومی دائرہ سے باہر کی کسی چیز کی قدر ماننے کے لیے تیار نہ تھے، اب بیت المقدس سے کعبہ کی طرف رُخ گھما دینے کا مدعا یہ ہے کہ اسرائیلیت کا بُت بھی ٹوٹ جائے۔ ایک کام پہلے ہو چکا تھا، دوسرا اب کر دیا گیا۔ عربیت کے پرستار پہلے چھٹ چکے تھے اور اسرائیلیت کے پرستار اب چھٹ جائیں گے، اس طرح نفاق کے گھن سے نیا اسلامی معاشرہ پاک ہو سکے گا۔ اب اس حلقہ میں وہی لوگ رہیں گے جن کی نگاہ میں اصل احترام اللہ کے فرمان اور اس کے رسول کی سنت کا ہے۔ یہ موڑ جس سے تحریکِ اسلامی گذر رہی ہے، رسول کا دامن پورے اعتماد کے ساتھ تھام کر چلنے والوں کو ان تمام بے اصول افراد سے چھانٹ کر الگ کر دے گا جو اس حقیقت پر ایمان رکھتے ہوں کہ مشرق و مغرب سب اللہ کے ہیں اور اصل مرکزِ اطاعت

[1] تفہیم القرآن - ج ۱ صفحہ ۱۱۹ تا ۱۲۱-

وہ ہے، نیز جو اس نکتہ کے راز داں ہیں کہ نیکی مشرق یا مغرب کی طرف رُخ کرنے کا نام نہیں ہے، بلکہ ان ظاہری اشکالِ شریعت کے اندر کام کرنے والی جس روح کا نام نیکی ہے وہ اللہ تعالیٰ پر، یومِ آخرت پر، فرشتوں پر، خدا کی کتابوں اور اس کے پیغمبروں پر ایمان رکھنا اور اس کی راہ میں اپنا مال خرچ کرنا ہے۔ سو تمہیں قبلہ کے ظاہری شعار کو قائم کرنے میں جس چیز کا اہتمام کرنا چاہیے وہ ہے " استبقوا الخیرات " یعنی نیکیوں کی طرف لپکو اور بھلائیوں کی طرف رُخ کرو۔ تمہیں چاہیے کہ تم خدا کے بڑے سے بڑے تغیر آفرین اور انقلاب انگیز حکم کی تعمیل کرنے میں کسی مخالف طاقت سے نہ ڈرو، صرف اسی ایک سے ڈرو۔ اس کا مطالبہ ہے کہ " فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي "!

قرآن نے حاکمِ کائنات کا فرمان سنانے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ واقعہ بجز اہلِ ایمان و یقین کے ہر کسی پر شاق گذرے گا۔ اس پر جب ہنگامہ کھڑا ہوگا تو گھبراہٹ چھا جائیگی اور گلی گلی وہ کج بحثیاں شروع ہونگی کہ کمزور لوگوں کے سر چکرا جائیں گے اور جذبات میں ایک ہل چل مچے گی۔ اب سنیے کہ قیل و قال کیا کچھ ہوئی۔

مشرکین نے کہا کہ لیجیے اب ہوش کچھ تو ٹھکانے آئی، ہمارا قبلہ اختیار کر لیا ہے تو آہستہ آہستہ یہ لوگ ہمارے مذہب کی طرف بھی از خود لوٹ آئیں گے۔

یہود نے کہا کہ داعیٔ اسلام نے ہماری مخالفت کے جوش میں قبلۂ انبیاء کو چھوڑ دیا، حالانکہ اگر یہ نبی ہوتا تو کبھی بھی اس قبلہ کو نہ چھوڑتا۔

نفاق کے مریض کہتے تھے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا صحیح قبلہ کدھر کو ہے، اگر پہلا قبلہ برحق تھا تو اب وہ چھوڑ دیا، اور اگر اب دوسرا قبلہ درست ہے تو پہلے جو کچھ تھا وہ غلط تھا۔ قبلہ کیا بڑا کھیل ہو گیا، جی چاہا اِدھر منہ موڑ لیا، جی چاہا اُدھر رُخ کر لیا! یہ تو سارا مذہب ہی بس مرضی کا کھیل ہے۔

اور جو لوگ ایمان و یقین کی روح سے مالا مال تھے انہوں نے کہا کہ ہم نے حکم کو سنا اور اس کی اطاعت قبول کی اور ہم اس پر ایمان لائے، یہ سب کچھ ہمارے پروردگار کی جانب سے ہے [1]!

یہی اہلِ ایمان بیچارے پروپگنڈہ کی آندھی میں گھر گئے اور چاروں طرف سے سوالات، بحثوں اور طنز و

---

[1] زاد المعاد ج ۲ صفحہ ۵۸

تضحیک کے تیروں کی بوچھاڑ شروع ہوگئی۔ مجلس مجلس معرکہ آرا گفتگوئیں تھیں، گلی گلی ہاؤ ہو مچ رہی تھی، لمحہ لمحہ جذباتی ہیجان پیدا ہوتے تھے۔ انقلابی تحریکوں میں ہر بڑی تبدیلی اور ہر بڑے موڑ پر اور لوگوں کے خیالات کے بتوں کو توڑنے والے ہر اقدام پر اس طرح کے طوفانی ہنگامے پیش آجاتے ہیں اور ایسے حالات میں ان کے کارکن گھبراہٹ اور پریشانی میں مبتلا ہو کر بسا اوقات اشتعال کی حد تک جا پہنچتے ہیں۔

اس اندیشے کے پیش نظر نصیحت کر دی گئی کہ ان گردابوں کو پار کرنے کے لیے صبر و صلوٰۃ کے مضبوط سفینے ہی کارآمد ہو سکتے ہیں۔ مخالفانہ پروپگنڈہ کرنے والوں کے بارے میں بتایا گیا کہ ان کا مقصود تلاشِ حق ہرگز نہیں ہے اور یہ دلائل سے مطمئن ہونے پر بالکل تیار نہیں ہیں۔ ان کے سوالات کا مدعا محض پریشان کرنا ہے۔ یہ اس وقت تک راضی نہیں ہو سکتے جب تک کہ تم لوگ اپنا اصول اور نظام چھوڑ کر ان کی مریدی نہ اختیار کر لو۔

بیہودہ نکتہ طرازیوں کے جواب میں اتمامِ حجت کے طور پر تحریکِ اسلامی کی طرف سے سنجیدہ و متین انداز سے زوردار استدلال کیا گیا اور عوام الناس کے سامنے کعبہ کی عظمت کو سورۂ آل عمران کے ایک خطاب میں واضح کر دیا گیا۔ ارشاد ہوا:-

> "بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کے لیے تعمیر ہوئی وہ وہی ہے جو مکہ میں واقع ہے۔ اس کو خیر و برکت دی گئی تھی اور تمام جہان والوں کے لیے مرکزِ ہدایت بنایا گیا تھا۔ اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں، ابراہیمؑ کا مقامِ عبادت ہے اور اس کی شان یہ ہے کہ جو اس میں داخل ہوا مامون ہو گیا۔ لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے، اور جو کوئی اس حکم کی پیروی سے انکار کرے تو اسے معلوم ہو جانا چاہیے کہ اللہ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔"
>
> (آل عمران - ۹۶-۹۷)

بیت المقدس کے متعلق یہ حقیقت خود بائبل سے ثابت تھی کہ اسے حضرت موسیٰ کے ساڑھے چار صدیاں بعد حضرت سلیمانؑ نے تعمیر کرایا تھا۔ اور دورِ سلیمانی ہی میں اسے خدا پرستوں کا قبلہ مقرر کیا گیا

تھا۔اس کے برعکس تاریخی اور مذہبی دونوں طرح کی متفقہ اور متواتر روایات سے یہ ثابت تھا کہ کعبہ کو حضرت ابراہیمؑ نے استوار کیا تھا اور حضرت ابراہیمؑ حضرت موسیٰؑ سے آٹھ نو صدیاں قبل ہو گزرے تھے۔کعبہ کی زمانی اولیت کے ساتھ ساتھ یہ بتایا گیا کہ اس کے پر تقدس ماحول میں بڑی اہم نشانیاں ہیں، اس میں دین کی بیش قیمت روایات جگمگا رہی ہیں۔نیکی کی علمبرداری کی ایک تاریخ اس کے سنگ و خشت پر مرقوم ہے، پھر اس میں ابراہیم علیہ السلام کی جائے عبادت واقع ہے جس کے سرچشمہ سے آج بھی ذوقِ توحید سیراب ہو سکتا ہے۔پھر اس مرکزِ عبادت کا مقبول بارگاہِ حق ہونا اس آیتِ بیّنہ سے آشکارا ہے کہ لق و دق صحرا میں تعمیر ہونے والی اس عمارت کے آس پاس ایک انسانی دنیا آباد ہو گئی ہے اور اس کی طرف لمبے لمبے فاصلے طے کر کے لوگ کھنچے چلے آتے ہیں۔پھر اس کے علوِ مرتبہ کی روشن دلیل یہ ہے کہ بے آب و گیاہ وادی کے آباد کاروں کے پاس ہر طرح کا رزق از خود پہنچ رہا ہے۔اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عرب کے جنگجو بدوی معاشرے کے طوفانی سمندر میں یہ گھر چار ہزار برس سے ایک جزیرۂ امن بنا کھڑا ہے۔جو کوئی اس کے دائرۂ حرمت میں داخل ہو جاتا ہے اس کے جان، مال اور آبرو کو تحفظ مل جاتا ہے، ایک دوسرے کے خون کے پیاسے اس کے سائے میں آ کر تلواریں نیام میں کر لیتے ہیں اور جذبات کی باگیں تھام لیتے ہیں، قاتل اور ڈاکو اس کی فضا میں سانس لیتے ہی امن پسند شہریوں میں بدل جاتے ہیں۔سو اس گھر کا حق تھا کہ یہ ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کا علم بلند کرنے والی تحریک کا روحانی مرکز قرار پائے۔اس میں دین یا عقل کے خلاف آخر کونسی بات واقع ہوئی ہے کہ اس پر گلی گلی چہ میگوئیاں کی جا رہی ہیں۔

اس استدلال کا اگر کوئی نتیجۂ خیر تھا تو وہ صرف عوام کے لیے تھا۔رہے یہود، سو انہوں نے تو تحویلِ قبلہ کے واقعہ کو مسلمانوں کی طرف سے ایک فیصلہ کن مخالفانہ اقدام قرار دیا جس کی وجہ سے ان کی وہ تمام امیدیں ختم ہو گئیں جو وہ مسلمانوں کے بارے میں دلوں کے اندر باندھے بیٹھے تھے۔انہیں معلوم ہو گیا کہ یہ جماعت ستنا شکار نہیں ہے۔دوسری طرف مسلمانوں پر بھی یہود کی نفسیات کے وہ تمام تاریک گوشے آشکارا ہو گئے جن کے ہوتے ہوئے وہ حسنِ ظن برقرار نہ رہ سکتا تھا جس کے ساتھ تعلقات کا آغاز کیا گیا تھا۔ان کو اندازہ ہو گیا کہ مدینہ میں بھی تحریک کو بس اپنے بل بوتے پر چلنا ہو گا اور مذہب و تقویٰ کے کاروباری اجارہ داروں

سے کسی تعاون و حمایت کی امیدیں باندھنا فضول ہے، بلکہ اُلٹا یہ خطرہ آہستہ آہستہ محسوس ہونے لگا کہ یہود کفار و مشرکین مکہ سے زیادہ گھناؤنے جذبات کے ساتھ تحریکِ حق کی راہ میں روڑے اٹکائیں گے۔ اس کے باوجود حضورؐ اور آپؐ کے رفقائے تحریک کا طرزِ عمل داعیانہ اخلاق پر استوار رہا اور جیسے کو تیسا کے اصول پر یہود اور دوسرے مخالفین سے کوئی معاملہ نہیں کیا گیا۔ کج بحثیوں اور طنز و تضحیک اور چھچھورپن پر مسلمان طرح دے جاتے، بات کرنی پڑتی تو مہذب اور معقول طریق سے استدلال کرنے پر اکتفا کرتے اور زیادتیوں پر عالی ظرفی سے صبر کرتے۔

بہرحال اب دلوں میں بھرا ہوا طوفان بند توڑ کر امڈ پڑا۔

بدتمیزیاں اور بیہودگیاں جو لوگ خود کوئی تعمیری نصب العین نہیں رکھتے وہ کسی تعمیری کام کو محض اس لیے نہیں ہونے دینا چاہتے کہ اس کی وجہ سے ان کا کھوکھلا پن دنیا بھر کے سامنے بے نقاب ہونے لگتا ہے یہی صورت یہود کی تھی۔ وہ برسوں سے مدینہ کے ماحول پر چھائے ہوئے تھے لیکن کبھی وہ اس قابل نہ ہوئے کہ پستیوں میں گری ہوئی انسانیت کو بلندی کردار پر لا سکیں، لوگوں کے ذہنوں کا تزکیہ کر سکیں اور ان کے اخلاق سنوار سکیں اور ان کو نظم اور تہذیب سکھا سکیں، ان کو امن و سلامتی کا کوئی نظام دے سکیں۔ وہ گری ہوئی انسانیت کو تو کیا سہارا دیتے خود اپنے آپ کو سنبھالنے کے قابل نہ تھے۔ دنیا کا ہر روگ ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا۔ اور وہ اپنے کسی روگ کا درماں کرنے کی سوجھ بوجھ نہ رکھتے تھے۔ اب جب ان کی آنکھوں کے سامنے ایک نئی طاقت ابھری اور اس نے لوگوں کے دل و دماغ میں زندگی بخش اصول و اعتقاد کے چراغ جلانے شروع کیے، ان کے کردار کے کھنڈروں کو صاف کر کے تعمیر نو کا آغاز کیا، ایک مقدس نصب العین کے سانچے میں ڈھال کر افراد تیار کرنے اور ان افراد کے بل پر ایک نظام امن و عدل کی تاسیس کرنے کی مہم شروع کر دی تو یہود جھنجلا اٹھے اور اس تعمیری تحریک کو ناکام کرنے کی ہر گھٹیا سے گھٹیا تدبیر اختیار کی۔ اس طرح کی منفی اور تخریبی طاقتیں جب کسی کی مخالفت پر کمر باندھتی ہیں تو شرافت اور معقولیت اور تہذیب کو اٹھا کے بالائے طاق رکھ دیتی ہیں۔ نہایت کمینگی کے ساتھ بدتمیزیاں کر کے ان کی شانِ تقدس کو گوارا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بدتمیزیوں کا محاذ بھی کھول دیا گیا۔

ان جانشینانِ انبیا اور علمبردارانِ کتابِ الٰہی اور مسند نشینانِ درس و افتاء نے بغض و عناد کے میخانے سے جام کے جام چڑھا کر جن کرتوتوں کا مظاہرہ کیا ان میں سے دو تین مثالیں یادگار رہیں گی۔ مذہب و تقویٰ کے یہ اجارہ دار جب حضور سرورِ عالم سے ملتے تو "السلام علیک" کہنے کے بجائے زبان کو ذرا سا گھما کر "السلام" سے حرفِ لام کو غائب کر دیتے یعنی "السام علیک" کہا کرتے۔ اس کلمہ کے معنی یہ تھے کہ اے مخاطب! تجھ پر موت وارد ہو۔ یہ سلوک کیا جا رہا تھا اس جلیل القدر ہستی سے جو ابراہیم اور موسیٰ اور یعقوب اور یوسف اور اسحٰق اور اسمٰعیل علیہم السلام ہی کے پیش کردہ پیغام کی تجدید کے لیے سرگرمِ عمل تھی، جو تورات کی اصل روح کی تجدید کرنے میں منہمک تھی، جو شریعتِ الٰہی اور قانونِ آسمانی ہی کے احیاء کے لیے محوِ جہاد تھی؛ بلکہ کہنا چاہیے کہ جو دراصل یہود کے فراموش کردہ فریضہ کو ادا کر رہی تھی اور انہی کا چھوڑا ہوا کام کر رہی تھی۔ ایک مرتبہ یہ تقدس مآبانِ مدینہ پیغمبرِ حق کے گھر پہ آئے تو غنڈوں اور کمینوں کا سا یہی لعنت استعمال کیا۔ اس بدتمیزی پر حضرت عائشہ نے پردے کے پیچھے سے سخت ردِ عمل دکھایا۔ وہ غصے میں جواب دیئے بغیر نہ رہ سکیں اور کہہ اٹھیں کہ کم بختو! تم پر موت وارد ہو۔ سرورِ عالم کے کان میں یہ آواز پڑ گئی، آپ نے ام المومنین کو سمجھایا: "عائشہ! نرمی سے کام لو!" حضرت عائشہ نے عرض کیا: "کچھ آپ نے سنا بھی کہ انہوں نے کیا کہا تھا؟" فرمایا: "سنا تو تھا، لیکن میں نے بھی "وعلیک" کہہ دیا، یہ کافی ہے!"

بدتمیزی کی دوسری مشہور شرمناک مثالیں جن کا ریکارڈ قرآن نے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا، ملاحظہ ہوں:

ایک یہ کہ بزمِ رسالت میں یہ اجارہ دارانِ تقویٰ رونق افروز ہوتے اور دورانِ گفتگو میں جہاں کہیں یہ کہنے کی ضرورت پیش آتی کہ ذرا ٹھہریئے، ہمیں بات کو سمجھنے کا موقع دیجیے تو اس موقع پر ایک ذو معنی لفظ استعمال کرتے یعنی رَاعِنَا۔ اس لفظ کا ظاہری مطلب تو وہی تھا کہ ہماری کچھ رعایت فرمائیے، ہماری بات سن لیجیے، ہماری جانب توجہ رکھیے۔ مگر دوسری طرف عبرانی زبان میں اس سے ملتا جلتا لفظ اس معنی میں استعمال ہوتا تھا کہ "سن تو بہرا ہو جائے"۔ علاوہ بریں عربی زبان میں بھی قریبی مادول سے اس کے ہم صوت الفاظ ایسے موجود تھے جن سے معانیٔ سوء نکلتے تھے۔ مثلاً رَعُنَ سے رعْنا سے ایک لفظ تھا "الرَّعاع" جس کے معنی تھے "سفلۃ الناس"۔ اس کو رَاعِنَا کی شکل دینا کچھ مشکل نہ تھا۔ اسی

طرح رٰعِنَا سے رعناً و رٰعِین میں جاہل اور بے عقل ہونے کے معنی پائے جاتے تھے۔ خدا ساز بان کو لوچکا کر اسے "وَاعِینَا" بھی بنایا جا سکتا تھا اور اس صورت میں معنی ہوتے: "اے ہمارے چرواہے، اے ہمارے گڈریے"! یہ مختلف صورتیں تھیں جنہیں علمائے یہود باں ہمہ جبہ و دستار مسمی صورت بنا بنا کر اختیار کرتے تھے۔ عوام بچارے بھلا لغت و ادب کے اتنے ماہر کہاں ہو سکتے تھے۔ یہ علمائے گرامی قدر تھے جو گھروں سے خوب تیاری کر کر کے آتے کہ آج کیا کیا بدتمیزیاں کی جانی چاہئیں۔ ان ہستیوں میں سے کم سے کم ایک، یعنی رفاعہ بن زید بن تابوت کے متعلق تو تاریخ میں واضح روایت محفوظ ہے کہ اخلاق و شرافت کی اس شاندار مثال کے قائم کرنے میں اس یہودی مولوی نے بھی حصہ لیا تھا یعنی ظاہراً دیکھیے تو بڑی شائستگی تھی، لیکن دلوں کی گہرائیوں میں اتر یئے تو اندر غنڈوں کی سی نفسیات کام کر رہی تھیں۔ آپس میں جانتے تھے کہ ہم وقت کی ممتاز شخصیت کا مذاق اڑا رہے ہیں، لیکن اگر کوئی ٹوک دیتا تو ارشاد فرماتے کہ واہ ہمیں تم نے بدتمیز سمجھا ہے۔ ہم تو ادب و احترام کے ساتھ عرض کر رہے ہیں کہ خدا ہمیں بھی سمجھانے کا موقع دیجئے!

دوسری یہ کہ دورانِ گفتگو میں محسنِ انسانیتؐ کو اکثر یہ جانشینانِ انبیا و رسل یوں خطاب کرتے: "اِسْمَعْ غَیْرَ مُسْمَعٍ"۔ اس کا ظاہری مطلب یہ تھا کہ ذرا سنیے، آپ کا احترام اس میں مانع ہے کہ آپ کو کوئی بات آپکی مرضی یا اجازت کے بغیر سنائی جا سکے۔ لیکن ان کی شر پسندانہ ذہنیت اس سے ایک اور مفہوم مراد لیتی۔ یہ کہ تم اس قابل نہیں ہو کہ تم کو کوئی بات سنائی سمجھائی جائے۔ اور یہ کہ خدا کرے تم بہرے ہو جاؤ، سننے کے قابل ہی نہ رہو۔

یہ گندا ذہن و کردار تھا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے کے لیے اٹھا تھا!

تیسری یہ کہ اہلِ ایمان حضورؐ کی مجلس میں بیٹھ کر جب کوئی ارشاد سنتے اور سمجھ لیتے تو ہدایت الٰہی کے تحت جذبۂ صادق سے پکار اٹھتے "سمعنا واطعنا" ہم نے ارشاد کو سن لیا اور ہم نے اس کی اطاعت اختیار کر لی۔ لیکن حاملینِ تورات ایسے موقعے پر بڑی ڈرامائی حرکت کرتے۔ پہلے زور سے پکارتے: "سمعنا — جی ہاں، ہم نے سن لیا ہے" پھر ذرا دھیمی آواز سے زبان کو لچکا کر اَطَعنا کے بجائے کہتے "عصینا" — ہم نے تمہاری بات کو رد کیا، نافرمانی کا عزم کر لیا ہے۔ یہاں بھی وہی مشکل کہ کوئی گرفت کرتا تو تیوری

چڑھا کر کہتے کہ تم نے ہم لوگوں کو اتنا نامعقول سمجھ لیا ہے، مخالفت کے جوش میں آکر ہم پر ایسی گھٹیا حرکت کا الزام لگاتے ہو، تم میں اپنے سے باہر کے علماً اور بزرگوں کا احترام باقی نہیں رہا، اپنے علاوہ کسی کو تم شریف اور معقول ماننے پر تیار نہیں ہو؟

غور فرمائیے کہ آخر اس طرح کی ذلیل حرکتوں سے کیا محسن انسانیت کے پیغام میں کیڑے پڑ چلے تھے؟ کیا اس بازاری اندازِ گفتگو کے زیر اثر سچائی اور انصاف کی اسلامی تحریک کی قدر و قیمت ختم ہو سکتی تھی؟ کیا اس کمینگی کے زور سے اسلامی جماعت کا وجود مٹ چلا تھا؟ گالیاں دینے اور منہ چڑانے سے کسی تعمیری طاقت کا ایک بال بھی بیکا نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اس میں سارا مزہ صرف اس قدر ہوتا ہے کہ مقابل کی جامد منفی اور تخریبی طاقت کے دل کا بخار نکل جاتا ہے۔ یہ بزرگ جب بزم نبوت میں اس طرح کے کارنامے انجام دے کر رخصت ہوتے ہونگے تو اپنی محفلوں میں جا کر فخر کرتے ہونگے کہ آج تو جی بس ہم ان نبی صاحب کو یہ اور یہ کہہ آئے۔ مریدوں میں بیٹھ کر اپنی قابلیت کا سکہ جماتے ہونگے کہ ہم نے لفظوں کے اُلٹ پھیر سے کیا کیا مطلب نکالے اور چپیاں کیسے ہیں۔ اور ہمارے صرف و نحو اور فصاحت و بلاغت کے علم نے اس معرکے میں ہمیں کتنی مدد بہم پہنچائی ہے۔

بزرگانِ یہود کے ان کارناموں میں عبرت کا درس یہ ہے کہ مذہبی لوگ جب انحطاط کا شکار ہوتے ہیں تو ان میں تحریفِ کلمات کی گندی بیماری پیدا ہو جاتی ہے، دوسرے ان کے اندر سے انسانیت اور شرافت اور تہذیب کے تقاضوں کا لحاظ بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ تیسرے ان کی حرکات کے ظاہر و باطن میں شرمناک تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔ چوتھے ان میں ایک طرح کی بزدلی پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ سیدھے سیدھے طریق سے دل کے گندے جذبات کو اگل بھی نہیں سکتے، بلکہ اپنی بدطینتی پر شرافت کی جعلی جھلیاں چڑھا چڑھا کر ملتے ہیں۔ یہ ایسی علامات ہیں جو کسی ذہن و فکر کے فاسد ہونے کی قطعی دلیل ہوتی ہیں۔ علی الخصوص بدزبانی اور بازاری اندازِ خطاب جہاں بھی پایا جائے وہاں حق اور انصاف اور سچائی سے کوئی تعلق باقی نہیں رہ سکتا۔ آدمی کا ہر ہر بول اور اس کا اندازِ گفتگو اس کی سیرت کا اسی طرح ترجمان ہوتا ہے جس طرح کھانے کی کسی دیگ میں سے اس کی خوشبو پھیل کر دور دور تک کھانے کی نوعیت اور اس کے مسالوں کے معیار کا اعلان کر دیتی ہے

اب اگر کسی دل و دماغ کی دیگ سے بدزبانی اور بدتمیزی کی ہنڈیا اُتر رہی ہو تو کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ اس کے اندر پاکیزہ خیالات اور شریفانہ جذبات سے ترکیب پا کر کوئی اعلیٰ سیرت پک رہی ہوگی۔ جب کسی شخص کو دیکھو کہ وہ اختلاف کرنے والوں کے خلاف بدزبانی اور بدتمیزی کی سطح پر اتر آیا ہے تو سمجھو کہ یہ اس سے مقابلے میں دلیل کی بازی بھی ہر چکا اور اخلاق کے مقابلے میں بھی شکست کھا چکا۔ اب یہ ہرا ہوا کھلاڑی محض دل کا بخار نکال رہا ہے۔ اور دل کا بخار نکالنے والی طاقتیں تاریخ میں کوئی اثر نہیں پا سکتیں۔ وہ بس دل کا بخار نکالتی رہتی ہیں اور تعمیری دعوتوں کے قافلے گام بہ گام آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

اتنے ہی پر بس نہیں ہو جاتی، مدینہ میں جب اذان کی ابتدا ہوئی تو چونکہ یہود کے روایتی مسلک کے خلاف یہ بھی نظامِ مذہب میں ایک بدعت تھی، لہٰذا وہ اس پر بھی بڑا پیچ و تاب کھاتے۔ خصوصاً وہ دیکھ رہے تھے کہ اذان کے کلمات اسلام کی پوری کی پوری انقلابی دعوت اور اس کے بنیادی نظریے کو جامعیت سے سامنے لے آتے ہیں اور دن میں پانچ مرتبہ ان کا پکارا جاتا ــــ اور اونچی اور خوش آئند آواز میں پکارا جانا۔ ایک مؤثر ذریعۂ نشر و اشاعت ہے۔ یہ آواز ان کی عورتوں، ان کے بچوں اور ان کے غلاموں کے کانوں میں پڑتی ہر روز پڑتی اور پانچ پانچ بار پڑتی۔ تصور کیجیے کہ جب یہ انوکھی آواز بلالی سوز و ساز کے ساتھ گونجتی ہوگی تو مدینہ کی ساری فضا میں سناٹا چھا جاتا ہوگا، اپنوں پرایوں کے دل متوجہ ہو جاتے ہونگے۔ خصوصاً ان کو وہ فرق محسوس ہوتا تھا جو گھنٹے اور ناقوس بجانے اور اذان پکارنے میں تھا اور جس کے بارے میں خود ان کے عوام بھی کچھ نہ کچھ احساس کرتے ہونگے گھنٹے اور ناقوس کی آواز ایک آواز تھی، اس میں نہ لفظ تھے نہ معنی تھے، بخلاف اسکے اذان کی آواز چند بولوں اور چند کلموں پر مشتمل تھی جن میں عام فہم معانی موجزن تھے۔ گھنٹے اور ناقوس کی آواز میں انسانی جذبات کا اظہار نہیں تھا لیکن اذان کی پکار میں انسانی قلب کا سوز و گداز کارفرما ہوتا تھا۔ اس فرق کو محسوس کرکے یہود بجائے اس کے کہ یہ اعتراف کر لیتے کہ اذان فی الواقع عبادت کی دعوت دینے کا بہتر اور مؤثر ذریعہ ہے اور اس کے کلمات قدر و قیمت رکھتے ہیں، وہ چڑ میں مبتلا ہو گئے۔ اپنی مجلسوں میں صحبتوں میں وہ اذان پکارنے والے کی آواز کو عجیب و غریب تشبیہیں دیتے، وہ نقلیں اتارتے اور اذان کے کلمات کو بگاڑ بگاڑ کر سامانِ تضحیک پیدا کرتے۔ حسد اور کینہ ان مذہب داروں کو بھانڈوں کی سطح تک جا گراتا تھا۔ مگر جو کام اذان کر رہی تھی اس کی روک تھام تضحیک اور نقالی اور بھانڈپن سے کیسے ہو سکتی تھی۔

بدتمیزیوں کی آخری حد یہ تھی کہ خود اللہ میاں کو بھی (نعوذ باللہ) نشانہ بنا لیا گیا۔ مثلاً جب یہ آیت اتری کہ "من ذالذی یقرض اللہ قرضاً حسناً۔ یعنی کون ہے جو اللہ کو اچھا قرض دے۔ تو بجائے اس کے کہ اس کے سیدھے صاف مفہوم کو اخذ کیا جاتا، یہودنے یہ کہہ کر مذاق اڑانا شروع کیا، لوگو! سنتے ہو، اب تو اللہ میاں بھی قلاش ہو گئے ہیں، لو اب وہ بندوں سے قرض مانگنے نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ خدا سے بے خوفی اور بے شرمی کی اس سے زیادہ ناپاک مثالیں کم ملتی ہیں۔

اسی طرح قرآن میں جہاں مکھی اور مچھر یا ایسی ہی بظاہر حقیر چیزوں کا بطور مثال تذکرہ ہُوا ہے اور ان کے وجود سے کوئی استدلال کیا گیا ہے، وہاں یہ لوگ ملذ تحقیر کا طوفان مچانے کا موقع پا لیتے۔ کہتے کہ ان مسلمانوں کا خدا بھی عجیب ہے کہ جسے مثال دینے کے لیے بھی ملتی ہیں تو ایسی حقیر چیزیں ملتی ہیں۔ اس استہزاء میں یہ استدلال بھی شامل ہوتا کہ قرآن خدا کا کلام کیسے ہو سکتا ہے جبکہ اس کے اندر ان گھٹیا چیزوں کا تذکرہ ہے۔ ان لوگوں کو کیا خوب جواب ملا کہ:

"ہاں، اللہ اس سے ہرگز نہیں شرماتا کہ مچھر یا اس سے بھی حقیر تر کسی چیز کی تمثیلیں دے۔ جو لوگ حق بات کے قبول کرنے والے ہیں وہ انہی تمثیلوں کو دیکھ کر جان لیتے ہیں کہ یہ حق ہے، جو ان کے رب ہی کی طرف سے آیا ہے، اور جو ماننے والے نہیں ہیں وہ انہیں سُن کر کہنے لگتے ہیں کہ ایسی تمثیلوں سے اللہ کو کیا سروکار؟" (البقرہ - ۲۶)

مضحکہ انگیز مطالبہ | یہود کی بدتمیزی طلبِ حجت کی شکل اختیار کر کے ایک عجیب مضحکہ انگیز مطالبہ بن گئی۔ حضورؐ سے کہنے لگے "لولا یکلمنا اللہ" (البقرہ - ۱۱۷) آخر یہ کیا جھمیلا ہے کہ خدا تمہاری طرف ایک فرشتہ در پردہ بھیجتا ہے اور بالا بالا ہی تم تک اپنی بات پہنچا دیتا ہے۔ کیوں نہیں وہ سامنے آکر ہم سے براہِ راست بات کرتا تاکہ وہ چاہتا کیا ہے۔ وہ زمین پر اترے، آنکھوں سے دکھائی دے اور ہم سے روبرو کہے کہ یہ اور یہ میرے احکام ہیں ان کو مانو اور یہ شخص میرا پیغمبر ہے اس کا دامن تھام کر چلو۔ یہ نہیں تو کم سے کم اتنا ہی کرے کہ کوئی صریح اور قاطع نشانی بھیج دے جس کے بعد کسی کو مجالِ انکار نہ رہے کہ تم اس کے نبی ہو اور قرآن اس کا کلام ہے۔

بہ خاطر نشانی بھی انہوں نے متعین صورت میں بتا دی جو ان کو مطمئن کر سکتی تھی۔ تاریخ و سیرت کے ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مطالبہ یہود کے حلقوں میں بڑی اہمیت اختیار کر گیا تھا، دیر تک اس کا چرچا رہا اور بار بار یہ آپؐ کے سامنے دوہرایا گیا۔

پہلے سنیے کہ یہ مضحکہ انگیز مطالبہ پیدا کیونکر ہوا؟ صورت واقعہ یہ تھی کہ مدینہ کے یہود حضورؐ کی بعثت سے قبل اوس اور خزرج کو زک دینے کے منصوبے بنا بنا کر آنے والے نبی کی فوری آمد کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ جب حضورؐ کی نبوت کا آفتاب طلوع ہو گیا تو یکایک انہوں نے پینترا بدل لیا اور انکار اور سرکشی کے مورچوں پر ڈٹ گئے۔ ان کی اس قلب ماہیت پر عام لوگوں میں عجیب سی حالت استعجاب پیدا ہو گئی۔ لوگ آ آ کر ان سے پوچھتے کہ یہ قصہ کیا ہے کہ پہلے آپ ہی حضرات یہ یہ دعائیں مانگتے تھے اور ایک نبی کی آمد کا مژدہ سناتے تھے اور اب آپ خود ہی آنے والے کی آمد پر بگڑ بیٹھے ہیں۔ خصوصاً ایک مجلس میں معاذ بن جبل اور بشر بن براء بن معرور جیسے ذہین اکابر نے یہودی بزرگوں سے صاف صاف کہا کہ "اے گروہِ یہود! اللہ سے ڈرو اور سرِ تسلیم خم کر دو، کیونکہ تم ہمارے خلاف تائید حاصل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے خود ہی بعثت محمدی کی آرزوئیں کیا کرتے تھے اور ہمارا حال یہ تھا کہ ہم اہل شرک تھے اور تم ہی ہمیں یہ خبر سنایا کرتے تھے کہ وہ مبعوث ہو چکا ہے اور پھر تم اس کے اوصاف ہمارے سامنے گنوایا کرتے تھے" اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایسی گفتگوؤں میں کس بری طرح یہودی ذہن کا پول کھل جاتا ہو گا اور وہ خود محسوس کر لیتے ہوں گے کہ ہمارے متعلق مخاطبین کی رائے کیا ہے۔ اپنی شانِ دیانت و تقویٰ کے بچاؤ کے لیے ناگزیر تھا کہ وہ ایک نہ ایک ڈھال فراہم کرتے۔ وہ ڈھال کیا تھی؟ اسے معلوم کرنے کے لیے اوپر کی بات کا جواب سنیے جو بنی نضیر کے ایک بزرگ سلام ابن مشکم کی زبان مبارک سے صادر ہوا۔ فرماتے ہیں: "محمدؐ اپنے ساتھ کوئی ایسی نشانی نہیں لایا جس کے ذریعے ہم اسے بہ حیثیت نبی کے پہچان سکتے۔ لہٰذا یہ وہ شخص نہیں ہے جس کے بارے میں ہم تم سے تذکرہ کیا کرتے تھے"[1] یہی بات ابو صلوبا فطیونی نے خود محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست بھی کر دی تھی۔ یعنی ایک فیصلہ کن نشانی چاہیے تھی ——— اور اس کا تعین کرنا یہود کا کام تھا، وہ جیسی نشانی

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۱۹۶

کا بھی چاہیں، مطالبہ کریں! اسی طرح لوگوں کی طرف سے اس میثاق کا سوال اٹھایا گیا جو نبی آخر الزماں کے بارے میں سابق انبیاء سے انہوں نے استوار کیا تھا تو اس پر بھی ان لوگوں نے آئیں بائیں شائیں کر دی۔ مالک بن الصیف نے ایک بار صاف صاف کہہ دیا کہ "خدا کی قسم، محمدؐ کے بارے میں ہم سے کوئی عہد نہیں لیا گیا"[1]

ان کے لیے قرآن کے پاکیزہ کلام اور ہل چل مچا دینے والے استدلال میں کوئی نشانی نہ تھی، محسن انسانیت کے کردار میں کوئی نشانی نہ تھی، زندگی کا نقشہ بدلنے والی تحریک کی لہروں میں کوئی نشانی نہ تھی، علمبرداران حق کی پروان چڑھتی ہوئی جماعت میں کوئی نشانی نہ تھی، ان قربانیوں اور جانبازیوں میں کوئی نشانی نہ تھی جو مٹھی بھر مسلمان ظلم و تشدد کے ہتھیاروں سے کام لینے والی بااثر طاقتوں کے مقابلے میں دکھا رہے تھے۔ ان کو تو بس کوئی عجوبہ اور کوئی تماشا چاہیے تھا۔

اب سنیے کہ کس نشانی کا مطالبہ تھا!

رافع بن حریملہ اور وہب بن زید حضور سرور کائنات کی خدمت میں آئے، باتیں ہوئیں، کہنے لگے کہ:

"اے محمد! ہمارے سامنے لکھی لکھائی کتاب لاؤ جسے آسمان سے ہمارے اوپر اتر وا لو، اور ہم اسے بطور خود پڑھیں اور ہمارے سامنے چشمے جاری کر دو، پھر ہم تمہارے پیچھے چلیں گے اور تمہاری صداقت کی گواہی دیں گے"[2]

اسی رافع بن حریملہ نے یہ تقاضا بھی کیا کہ "اے محمدؐ! اگر تم اللہ کے رسول ہو، جیسے کہ تم خود کہتے ہو تو ذرا اللہ سے یہ کہو کہ وہ ہم سے بات کرے، یہاں تک کہ ہم اس کی بات خود سُن لیں"[3]

ایک اور مجلس میں فنحاص، عبداللہ ابن صوریا ابن صلوبا، کنانہ بن ربیع بن ابی الحقیق، اشیع، کعب بن اسد، شمویل بن زید، جبل بن عمرو بن سکینہ جیسے بزرگان یہود حضور سرور عالم سے گفتگو کر رہے تھے۔ کہنے لگے: "اے محمدؐ! کیا واقعی یہ قرآن تمہیں کوئی جن یا کوئی انسان نہیں سکھاتا؟" رسول خدا نے فرمایا: "تم خوب سمجھتے ہو کہ یہ خدا کی طرف سے ہے اور یہ کہ میں خدا کا رسول ہوں، تم اس حقیقت کو اپنے ہاں

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۱۹۶ [2] ایضاً ص ۱۹۷ [3] ایضاً ص ۱۹۸

تورات میں مرقوم دیکھتے ہو۔" اس پر وہ کہنے لگے: "اے محمدؐ! پھر حقیقت یہ ہے کہ جب خدا اپنے کسی رسول کو برپا کر دیتا ہے تو پھر جو کچھ بھی وہ رسول چاہے، خدا اس کے لیے وہی کچھ کر دیتا ہے اور رسول جس بات کا بھی ارادہ کرے خدا کی طرف سے وہی کچھ کر دکھانے کا اختیار پا لیتا ہے، سو تم آسمان سے ہمارے اوپر لکھی لکھائی کتاب کو اتروا دو جسے ہم پڑھیں اور پہچانیں[1]۔"

یہود نے بڑی کارگر ڈھال تلاش کر لی۔ اب کوئی سوال نہ رہا اس کا کہ داعیٔ حق کی دعوت کیا ہے؟ وہ کیا بات کہتا ہے؟ اس کے پیچھے دلائل کیا رکھتا ہے؟ اس کی دعوت کے اثر سے کیسی زندگی بنتی ہے؟ اس کی تعلیم و تربیت سے کس نوعیت کی سیرت پروان چڑھتی ہے؟ اس کے تعمیری کام سے کیسا نظامِ تمدن بنتا ہے؟ یہ سارے سوالات پیچھے چلے گئے اور سامنے یہ مطالبہ آ گیا کہ آسمان سے کتاب اتار کے دکھاؤ! اب لوگوں کا منہ بند کرنے کے لیے ایک ذریعہ ہاتھ آ گیا جس نے بات چھیڑی اس سے کہہ دیا کہ ہم تو ماننے کو تیار بیٹھے ہیں، لیکن ان سے جا کر کہو کہ وہ نبیٔ برحق ہوں تو اللہ میاں سے کہہ کر خدا یہ ایک نشانی دکھا دیں۔ اللہ والوں کی شان یہ ہوتی ہے کہ وہ جو کچھ چاہتے ہیں اوپر سے منوا لیتے ہیں، پھر وہ کیسا رسول ہے جس کی بات عالمِ بالا میں درخورِ اعتنا ہی نہیں ہے۔ لوگو، چھوڑو ان انتشار انگیز باتوں کو، جاؤ کسی اللہ والے کا دامن تھام لو۔ یہ تو بس یونہی ڈھکوسلہ ہے۔

(باقی)

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۱۹-۲۲۰

سنّت کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ کا موقف

[یہ مضمون ایک مصری عالم استاذ محمد ابوزہرہ کی تالیف "ابوحنیفہؒ" کے ایک باب کا ترجمہ ہے۔ منکرینِ حدیث وسنت اور بعض دیگر حلقوں کی جانب سے امام ابوحنیفہؒ کے خلاف حدیث کے انکار واستخفاف کا بے اصل الزام عائد کیا جاتا ہے۔ اگرچہ فاضل مصنف کے پیشِ نظر اس الزام کی تردید نہیں تھی، لیکن ضمناً اس الزام کا جواب بھی بحث میں آگیا ہے۔ یہ ترجمہ جناب خلیل حامدی صاحب نے کیا ہے اور امید ہے کہ وہ اس سلسلے کو جاری رکھیں گے]۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب اللہ کے بعد دوسری جس چیز کو اپنے اجتہادات اور استنباطِ مسائل کا ماخذ ومرجع بنایا ہے وہ سنتِ رسول ہے۔ ترتیبِ مراتب کے لحاظ سے کتاب اللہ کے بعد سنت کا درجہ ہے کیونکہ کتاب اللہ شریعتِ محمدی کا بنیادی ستون اور اصل سرچشمۂ ہدایت وارشاد ہے اور کتاب اللہ ہی سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ شریعت کے ماخذ ومصادر میں سے ایک ماخذ سنتِ رسول ہے۔ اسی بنا پر سنت کو مصدرِ تشریع ہونے کے اعتبار سے اور احکامِ شرعی کی بنائے استدلال ہونے کے لحاظ سے قرآن کے بعد کا درجہ حاصل ہے۔ تفاوتِ مرتبہ کی دوسری وجہ یہ ہے کہ سنت کتابِ الٰہی کی مُبیّن ہے (یعنی کتاب اللہ کی مجمل آیات کی تفسیر کرتی ہے مطلق کو مقید اور عام کو خاص کرتی ہے اور محتمل المعانی نصوص کی مراد متعین کرتی ہے)، اور یہ بدیہی امر ہے کہ مبیّن کا درجہ مبیَّن (جس کا بیان اور تفسیر ہو) کے بعد ہوتا ہے پس مبیّن ہونے کی حیثیت سے سنت بمنزلہ خادم اور تابع کے ہے اور کتاب اللہ متبوع اور مخدوم ہے۔ کتاب اللہ کا ماخذ اول اور سنتِ رسول کا ماخذ ثانی ہونا خود شارع علیہ السلام کے متعدد ارشادات اور صحابہ رضوان اللہ علیہم کے آثار سے ثابت ہے۔ مثال کے طور پر حضرت معاذ والی حدیث کو لیجیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذؓ کو یمن کا گورنر مقرر کیا تو آپ نے حضرت معاذ سے دریافت فرمایا: "تم مقدمات کا فیصلہ کس طرح کرو گے؟" معاذؓ نے جواب دیا "اللہ تعالیٰ کی کتاب کو پیشِ نظر رکھوں گا۔" آپ نے ارشاد فرمایا: "اگر پیش آمدہ معاملے میں کتاب اللہ میں تمھیں کوئی رہنمائی نہ ملے تو

پھر کیا کرو گے؟" معاذ نے عرض کیا: "سنتِ رسول کی روشنی میں فیصلہ کروں گا۔" آپؐ نے پھر پوچھا: اگر سنت بھی اس معاملے میں خاموش ہو تو پھر کونسا راستہ اختیار کرو گے؟ معاذ نے کہا: "اجتہد برائی" یعنی ایسی صورت میں فصلِ مقدمات کے لیے میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔

۲۔ دوسری مثال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک اثر سے ملتی ہے۔ حضرت عمرؓ قاضی شُریح کے نام ایک فرمان میں لکھتے ہیں: "اگر تمہارے پاس کوئی ایسا معاملہ آئے جس کا حکم کتاب الٰہی میں موجود ہو تو اسی کے مطابق فیصلہ کرو۔ اور اگر کوئی ایسا معاملہ تمہاری عدالت میں پیش ہو جس کے بارے میں کتاب الٰہی کوئی حکم نہ دے رہی ہو تو سنتِ رسول کو دیکھو اور اسی کی رہنمائی میں فیصلہ کرو۔"

۳۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "تم میں سے کسی کے پاس کوئی معاملہ پیش ہو اس کو چاہیے کہ اس کا فیصلہ کتاب الٰہی کے مطابق کرے۔ اور اگر کوئی ایسا معاملہ ہو جس کے متعلق کتاب الٰہی میں حکم مذکور نہ ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر نظر کرے اور ان ہی کے بموجب فیصلہ دے۔"

اسی طرح کا ایک اثر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔

حنفیہ کے نزدیک فرض اور واجب کا فرق

بہر حال یہ بات امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اپنے اقوال و آثار اور ان کی اپنی تصریحات سے پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ امام موصوف نے مسائلِ فقہیہ کی تخریجات اور تفریعات میں کتاب اللہ کو مقدم اور سنت کو مؤخر رکھا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ فقہائے حنفیہ نے اسی اصول کے پیشِ نظر ان احکام کے درمیان جو نصوصِ قرآن سے دلالتِ قطعیہ کے ساتھ ثابت ہوتے ہیں اور ان احکام کے درمیان جو احادیثِ ظنیہ (متواتر اور مشہور کے علاوہ احادیث) سے ثابت ہوتے ہیں، امتیاز اور فرق قائم کیا ہے۔ حنفیہ کے نزدیک وہ امر (کسی چیز کے کرنے کا مطالبہ) جو نصِ قرآنی سے صادر ہو فرض ہے اور اس کے مقابلے میں جس امر کی بنیاد ظنی الثبوت حدیث پر ہو وہ واجب ہوتا ہے۔ (اس کی وجہ یہ ہے کہ فرضیت قطعی ثبوت کی محتاج ہے اور حدیثِ ظنی سے قطعیت ثابت نہیں ہوتی بلکہ ظنِ غالب حاصل ہوتا ہے)۔ یہی تفریق وہ نہی (کسی چیز سے رک جانے کے مطالبے) کے بارے میں بھی کرتے ہیں۔ قرآن نے جس چیز سے نہی کر دی ہے، اگر اس کے مفہوم کی دلالت ظن پر نہیں ہے تو وہ چیز حرام ہے اور جس چیز کی نہی حدیثِ ظنی سے

ہو وہ زیادہ سے مکروہ تحریمی ہوگی خواہ وہ اپنے مفہوم میں قطعی الدلالۃ ہو یا ظنی الدلالۃ ! یہ تمام اختلاف مدارج اس بناء پر قائم ہے کہ حدیث ظنی ایک طرف اپنے فی نفسہ ثبوت میں قرآن سے درجۂ ثانی پر ہے اور دوسری طرف احکام و مسائل کا ماخذ و مرجع ہونے میں بھی اُسے مابعد الکتاب حیثیت حاصل ہے۔

امام صاحب قیاس کو کس مرتبے میں رکھتے تھے؟ اب رہا یہ سوال کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے استنباطِ فقہی میں حدیث پر کس قدر اعتماد کرتے تھے اور حدیث کو کس حد تک مصدرِ تشریع تسلیم کرتے تھے؟ اس میں فقہاء کے درمیان کافی اختلاف اور نزاع برپا ہے۔ جن لوگوں نے امام صاحب کے اعتماد علی الحدیث کو ناقص اور ناتمام ٹھہرایا ہے، ان میں سے بعض حضرات نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ امام صاحب قیاس کو سنت پر ترجیح دیتے تھے۔ لیکن ہمارے لیے اختلافات و مناقشات سے ہٹ کر امام صاحب پر عائد شدہ الزام کی حقیقت اور ان کے استنادِ حدیث کی نوعیت کو جانچنے کے لیے ضروری ہے کہ تفصیل سے گفتگو کریں اور ان فروعات و آثار کا تتبع کریں جو امام صاحب سے منقول ہیں۔ نیز ان فقہی آراء کی تحقیق کریں جو کسی خاص حدیث کے معاملہ میں انہوں نے قائم کی ہیں تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ آیا فی الواقع امام صاحب نے کسی حدیث کی مخالفت کی ہے یا اُن کا مسلک حدیث کے موافق ہی رہا ہے؟ اگر وہ کسی حدیث کی مخالفت میں گئے ہیں تو کیا اس کی وجہ ان کی لاعلمی تھی۔ یعنی وہ حدیث ہی ان تک نہ پہنچی ہو؟ اور اگر حدیث کا علم ہونے کے باوجود انہوں نے حدیث کے مخالف فتویٰ دیا ہے تو کیا اس کا سبب یہ تھا کہ ان کے سامنے قرآن و سنت ہی سے کوئی دوسری قوی تر اصل موجود تھی؟ یا یہ مخالفت یکسر بے بنیاد اور بے اصل تھی؟ ان تمام سوالات کا جواب فراہم کرنے کے لیے اگرچہ محنت و کاوش کا بہت سا سرمایہ درکار ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ان مذکورہ بالا پہلوؤں کی عدل و انصاف کے ساتھ توضیح اور تنقیح ہو جائے تو اس سے نہ صرف ابوحنیفہ کے فقہی ذہن اور ان کے اجتہادی فکر کا رنگ کھل کر سامنے آجائے گا بلکہ وہ خصوصیات بھی نمایاں ہو جائیں گی جو ان کی فقہ کو دوسرے ائمہ کی فقہ سے ممتاز کرتی ہیں اور امام صاحب کے مخالفین اور متبعین کے مابین جو مخاصمت و مجادلت برپا ہے اُس کی حقیقت بھی آشکار ہو جائے گی۔ لیکن قبل اس کے کہ فقہ حنفی کے علماء اصول کی تعابیر کی طرف توجہ مبذول کی جائے، امام صاحب کی آراء اور ان کے مجتہدات سے استخراج قواعد کرنے والوں کے خیالات سنے جائیں،

یا امام صاحب کے اعتماد علی الحدیث کی کیفیت و کمیت کا جائزہ لیا جائے، ہم چاہتے ہیں کہ آغازِ کلام ہی میں اس الزام کا بطلان ثابت کر دیں کہ امام صاحب نے قیاس کو سنت پر ترجیح دی ہے یا ان احادیث کو رد کر دیا ہے جو بعض علماء حدیث کے نزدیک پایۂ صحت تک پہنچ چکی تھیں!

امام ابوحنیفہ پر مخالفتِ حدیث کا اتہام ان کی زندگی کے بعد نہیں بلکہ ان کی زندگی ہی میں لگایا گیا تھا۔ البتہ جن لوگوں کو امام صاحب کی تنقیص و تذلیل میں مزہ آتا تھا انہوں نے امام صاحب کی وفات کے بعد اس کا چرچا پہلے سے زیادہ کرنا شروع کر دیا۔ امام صاحب نے اس بے سروپا الزام کی شدت کے ساتھ تردید کر دی تھی۔ چنانچہ اکثر فرمایا کرتے تھے:۔

كذب والله وافترى علينا من يقول اننا نقدم القياس على النص، وهل يحتاج بعد النص الى قياس۔ (الميزان للشعراني ص ۵۱)

جو شخص یہ کہتا ہے کہ ہم کتاب و سنت کی نصوص پر قیاس کو ترجیح دیتے ہیں، خدا کی قسم وہ ہم پر جھوٹا افترا باندھتا ہے۔ کیا نص مل جانے کے بعد بھی کسی قیاس کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے

یہ قول اس بات کی قطعی اور واضح دلیل ہے کہ امام صاحب بامر مجبوری صرف اسی وقت تک قیاس سے کام لیتے تھے جب تک انہیں کسی نص کا سراغ نہیں مل جاتا تھا۔ جونہی کسی مسئلہ کے بارے میں انہیں کوئی نص مل جاتی تھی اُن کے نزدیک قیاس کی ضرورت ختم ہو جاتی تھی۔ مذکورۃ الصدر کتاب (المیزان للشعرانی) میں امام صاحب کی مذکورہ تصریح کے علاوہ اور بھی متعدد تصریحات موجود ہیں جن میں سے چند ذیل میں نقل کی جاتی ہیں:۔

۱۔ نحن لا نقيس الا عند الضرورة الشديدة، وذالك اننا ننظر فى دليل المسئلة من الكتاب والسنة او اقضية الصحابة، فان لم نجد دليلا قسنا حينئذ مسكوتا عنه على منطوق به۔

شدت ضرورت کے تحت ہی ہم دامنِ قیاس میں پناہ لیتے ہیں۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اولاً ہم مسئلہ زیرِ غور کی دلیل کتاب و سنت یا وہاں سے نہ ملنے پر صحابہ کے فیصلوں میں دیکھتے ہیں۔ اگر ہمیں ان تینوں ذریعوں میں کوئی دلیل نہیں ملتی، تب ہم منصوص (منطوق بہ) حکم پر غیر منصوص (مسکوت عنہ) کو قیاس کر کے مسئلہ کی شرعی حیثیت معلوم کرتے ہیں۔

۲- ایک دوسری روایت میں فرماتے ہیں:-

انّا ناخذ اولا بكتاب الله ثم بالسنّة ثم باقضية الصحابة، ونعمل بما يتفقون عليه، فان اختلفوا، قسنا حكما على حكم بجامع العلة بين المسئلتين حتى يتضح المعنى۔

ہم سب سے پہلے کتاب الٰہی کو عمل کی بنیاد بناتے ہیں پھر سنت رسول کو، ان دونوں ماخذوں میں جب کوئی حکم نہیں ملتا تو پھر صحابہ کرام کے فیصلوں کی طرف رجوع کرتے ہیں جس بات پر صحابہ میں اتفاق ہوتا ہے اس پر ہم عمل کرتے ہیں۔ اگر خود صحابہ میں اختلاف پایا جاتا ہو تو پھر ہم قیاس کرتے ہیں اور مقیس علیہ (جس معاملے میں حکم منصوص موجود ہے) اور مقیس (زیر بحث مسئلہ) کی علت مشترکہ دیکھ کر مقیس پر حکم لگا دیتے ہیں حتیٰ کہ اس کی شرعی نوعیت واضح ہو جاتی ہے۔

۳- ما جاء عن رسول الله صلى الله عليه وسلم فعلى الراس والعين بابي وامي، وليس لنا مخالفته، وما جاء عن اصحابه تخيّرنا، وما جاء عن غيرهم فهم رجال ونحن رجال۔

ہر وہ بات جو رسول خدا فداہ ابی وامی کی طرف سے آئے وہ سر آنکھوں پر، اس کی مخالفت کا ہمیں کوئی حق نہیں، اور جو بات صحابہؓ سے ہم تک پہنچے اس میں ہمیں انتخاب کا حق ہے۔ اور صحابہ کے علاوہ (تابعین و تبع تابعین) سے جو بات آئے اس میں وہ اور ہم برابر کے انسان ہیں (یعنی اس کی پیروی کے ہم مکلف نہیں ہیں)۔

۴- انا نعمل اولا بكتاب الله، ثم بسنة رسول الله صلى الله عليه وسلم، ثم باحاديث ابي بكر وعمر وعثمان وعلي رضي الله عنهم۔

سب سے پہلے ہمارا عمل کتاب الٰہی پر ہوتا ہے اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر، ان دونوں کے بعد خلفائے اربعہ ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کی احادیث کو معمول بہ بناتے ہیں۔

۵- امام صاحب کے متعلق ایک روایت یہ بھی آتی ہے کہ ایک دفعہ خلیفہ جعفر منصور نے امام صاحب

کو لکھا: "مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ آپ قیاس کو حدیث پر ترجیح دیتے ہیں"۔ امام صاحب نے جواب میں لکھا:-

لیس الامر کذالک یا امیرالمومنین، انما اعمل اولا بکتاب اللہ، ثم بسنة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ثم باقضیة ابی بکر وعمر وعثمان وعلی رضی اللہ عنہم ثم باقضیہ بقیة الصحابة ثم اقیس بعد اذا اختلفوا، ولیس بین اللہ وبین خلقہ قرابة۔

(المیزان للشعرانی ج ۱ ص ۶۲)

اے امیرالمومنین! آپ کی اطلاعات صحیح نہیں ہیں۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ میں سب سے پہلے کتاب اللہ کو اپنے عمل کا ماخذ بناتا ہوں، اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی طرف رجوع کرتا ہوں، اور پھر ابوبکر و عمر اور عثمان و علی رضی اللہ عنہم کے فیصلوں سے رہنمائی لیتا ہوں (خلفائے اربعہ کے بعد) پھر بقیہ صحابہ کے فیصلوں اور احادیث کو دیکھتا ہوں۔ اگر ان میں کوئی اختلاف نہ ہو تو ان پر عمل کرتا ہوں، اگر ان میں اختلاف پاتا ہوں تو پھر قیاس کی طرف رخ کرتا ہوں اور (میرا عقیدہ ہے کہ) خدا اور خلق کے درمیان کوئی نسبی رشتہ نہیں ہے (جس کی بنا پر بعض کو بعض پر فوقیت حاصل ہو)۔

مذکورۃ الصدر تمام تصریحات خود امام صاحب کی طرف سے منقول ہیں۔ ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب کو جب یہ خبریں پہنچیں کہ ان کے خلاف انکارِ سنت کے الزامات تراشے جا رہے ہیں تو انہوں نے فوراً اس طرح کے تمام اتہامات کی صاف صاف تردید کر دی، بلکہ تحریری طور پر خلیفہ جعفر منصور کے خط کے جواب میں اپنے متبع سنت ہونے کی وضاحت کر دی۔ ان تمام حقائق کی روشنی میں ہم یہ فیصلہ کرنے میں یقیناً حق بجانب ہیں کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک میں ترجیح القیاس علی الحدیث کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ بلکہ ہم پورے اطمینانِ قلب کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ کوئی ایسا مسلمان فقیہ نہیں ہے جس نے حدیث صحیح پر قیاس اور رائے کو مقدم رکھا ہو۔ بے شک بعض حالات میں روایت کو مسترد کر دیا جاتا ہے۔ اور مسلّمہ اصول دین کے خلاف ہونے یا قرآن سے متعارض ہونے کی صورت میں راوی کے کلام کو قبول نہیں کیا جاتا، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ حدیث پر قیاس کو ترجیح دے دی گئی ہے یا حدیث سے اعراض کر کے قیاس کو ماخذ شریعت بنا لیا گیا ہے۔ بلکہ ایسی روایت کے عدم قبول کا منشا یہ ہوتا ہے کہ کوئی حدیث جب کسی مسلّمہ نص قطعی سے ٹکرا رہی ہو تو سرے سے

اس روایت کی صحت تسلیم ہی نہیں کی جائے گی۔ اس سلسلے میں استنباطِ فقہی کا یہ اصول ہے کہ دلیلِ قاطع کا جب دلیلِ ظنّی سے تضاد واقع ہو جائے تو دلیل قاطع کو اختیار کر لیا جائے گا اور دلیلِ ظنّی کی نسبت عدمِ صحت کا حکم لگا دیا جائے گا۔ اس کی مزید تفصیلات ہم آئندہ اخبار آحاد پر بحث کرتے ہوئے بیان کریں گے۔

اب ہمارے سامنے تحقیق طلب یہ امر ہے کہ امام صاحب کس طرح کی احادیث کو قبول کرتے تھے اور کس قسم کی احادیث کو ردّ کر دیتے تھے۔

اقسام حدیث علماء اصول نے تعداد اور رواۃ کے اعتبار سے حدیث کی تین قسمیں کی ہیں:۔

(۱) متواتر، (۲) مشہور، (۳) اخبار آحاد یا اخبار خاصہ (دوسری صدی ہجری میں بعض فقہاء اخبار آحاد کو اخبار خاصہ کے نام سے بھی تعبیر کرتے تھے)۔

متواتر امام فخر الاسلام بزدوی متواتر حدیث کی تعریف میں لکھتے ہیں:۔

"متواتر حدیث وہ ہوتی ہے جس کے رُواۃ کی تعداد اس قدر کثیر لعدان گنت ہو کہ اُن کی کثرت تعداد، عدالت اور اختلافِ مقامات کی وجہ سے ان کا اجتماع علی الکذب وہم وگمان میں نہ آسکتا ہو۔ یعنی کہ یہ سلسلہ روایت اسی طرح آگے چلتا رہا ہو اور پہلے طبقے کے لوگوں سے لے کر اخیر زمانہ تک بے شمار راوی روایت کرتے چلے آئے ہوں۔ اس طرح کے تواتر کی مثالیں، قرآن کی آیات، پنجگانہ نمازیں، نماز کی رکعتوں کی تعداد، اور زکوٰۃ کے نصاب وغیرہ ہیں۔

تواتر معنوی کے لحاظ سے احادیثِ متواترہ بہت ہیں اور اُن کے تواتر پر کسی کا اختلاف نہیں ہے البتہ تواتر لفظی کے لحاظ سے متواتر احادیث بہت قلیل بلکہ نادر ہیں۔ اور جو ملتی ہیں ان کا تواتر بھی متفق علیہ نہیں ہے۔

تواتر لفظی کی مثال میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد پیش کیا جاتا ہے:۔

من کذب علیّ متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار۔	جس نے مجھ پر دانستہ جھوٹ کہا وہ آگ میں اپنا ٹھکانہ بنالے۔

تواتر معنوی کی احادیث میں سے ایک حدیث یہ ہے:

انما الاعمال بالنیات، وانما لکل امرئ مانوی، فمن کانت ھجرتہ الی اللہ ورسولہ فھجرتہ

الی اللہ و رسولہ، ومن کانت ھجرتہ لدنیا یصیبھا او امرأۃ ینکحھا، فھجرتہ الی ما ھاجر الیہ۔

تواتر کی تعریف میں اختلاف تواتر سے منقول ہونے والی احادیث واخبار علم یقینی کا موجب ہوتی ہیں۔ چنانچہ علماء کی اکثریت اس بات کی قائل ہے کہ حدیث متواتر سے حاصل ہونے والا علم عینی مشاہدے سے حاصل ہونے والے علم کے برابر ہے۔ مگر علماء کا ایک گروہ یہ رائے رکھتا ہے کہ احادیث متواترہ سے علم یقینی نہیں بلکہ علم طمانیت حاصل ہوتا ہے۔ طمانیت کا مفہوم اس گروہ کے نزدیک یہ ہے "جس میں شک اور غلط فہمی کا احتمال باقی رہے"۔ اس گروہ نے اپنی رائے کی توجیہ یہ کی ہے کہ تواتر کی حقیقت کیا ہے؟ یہ دراصل اخبار احاد کے مجموعہ ہی کا دوسرا نام ہے۔ اور ہر خبر واحد اپنی انفرادی صورت میں امکان کذب رکھتی ہے۔ جب مختلف ایسی خبریں جمع ہو جائیں جن میں ہر ایک احتمال کذب سے متصف ہو تو اس اجتماع سے ان کا احتمالِ کذب منقطع نہیں ہو جائے گا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ کذب ممکن الوجود اشیاء کی فہرست میں داخل ہے یعنی اُن اشیاء میں سے نہیں ہے جن کا دنیا میں پایا جانا دائرۂ امکان سے خارج ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اجتماعی صورت اختیار کرنے سے امکانِ کذب منقطع اور مستحیل ہو جاتا ہے تو اس کے لازمی نتیجہ میں یہ بھی باور کرنا پڑے گا کہ ایک ممکن الوجود شے کسی وقت میں ممتنع الوجود شے میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ حالانکہ از روئے اصولِ منطق یہ باطل ہے۔ اور جو امر مؤدی الی الباطل ہو جیسے امکانِ کذب کا انقطاع تسلیم کر لینا، وہ بھی باطل ہی ہوتا ہے۔ یہ صرف منطقیانہ کلیہ ہی نہیں بلکہ عملی واقعے سے بھی اس کی تائید و تصدیق ہوتی ہے۔ مثلاً بیشتر ایسی قومیں ہم دیکھتے ہیں جنہوں نے بالاتفاق ایسے واقعات و قصص کو قبول کر رکھا ہے جو سراپا غلط اور پایۂ صحت سے ساقط ہوتے ہیں اور ان کا بطلان دلائل و براہین سے ثابت ہو چکا ہے۔ بایں ہمہ ان واقعات کی قبولیت عامہ اُن قوموں کے اندر نسلاً بعد نسل بالتواتر چلی آ رہی ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ تواتر امکانِ کذب کے منافی نہیں ہے)۔

جمہور فقہاء کے نزدیک تواتر کی حقیقت فقہاء کی اکثریت جو اس اصول ہی کی قائل ہے کہ خبر متواتر سے عینی مشاہدے کے مساوی اور یقینی علم حاصل ہوتا ہے وہ اپنی تائید میں اس حقیقت کو پیش کرتی ہے کہ انسانی فطرت خبر متواتر اور مشاہدۂ عینی کو عملاً ہمیشہ ایک ہی درجے میں رکھتی رہی ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ لوگ جس طرح

اپنی اولادوں کو مشاہدۂ عینی کی رُو سے پہچانتے ہیں بعینہٖ اسی طرح وہ اپنے آباؤ اجداد کو اخبارِ متواترہ کے ذریعے سے جانتے ہیں یعنی لوگوں کو اپنے والدین کی بچپن کی نشوونما، جوانی اور بڑھاپے کے بارے میں متواتر خبروں کے ذریعے سے جس درجے کا یقینی علم ہوتا ہے وہ کسی صورت میں اُس علم یقینی سے کم تر نہیں ہوتا جو انہیں خود اپنی اولادوں کی نشوونما اور بڑھنے پھولنے کے متعلق برائی العین حاصل ہوتا ہے۔ اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ عامۃ الناس جس طرح کی یقینی شناخت اپنے مکانات کی سمتوں کے بارے میں رکھتے ہیں، جہتِ کعبہ کے بارے میں بھی اُسی طرح کی یقینی معرفت رکھتے ہیں۔ اول الذکر معرفت اُن کے عینی مشاہدہ پر مبنی ہوتی ہے اور موخر الذکر معرفت اخبارِ متواترہ کی بنا پر ہوتی ہے۔ مگر عملاً ان کے نزدیک معرفت برائی العین اور معرفت بخبر متواتر میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ عامۃ الناس کے اس فطری اجماع کو جو زمانہ ماقبل سے چلا آرہا ہے منطقی تحقیق نے بھی صحیح ثابت کر دیا ہے۔ تمام انسان پیدائشی طور پر مختلف طبائع اور متضاد ذوق رکھتے ہیں۔ ان میں کسی چیز پر اتفاق بہت شاذ و نادر ہوتا ہے۔ بایں ہمہ اگر اُن کے اندر کسی چیز پر اتفاق کُلی پایا جاتا ہے تو وہ دو امکانی صورتوں میں سے کسی ایک صورت کی بنا پر ہو گا۔ یا تو ان کا یہ ہمہ گیر اتفاق سماعت پر مبنی ہو گا یا اختراع پر۔ لیکن یہ امر بالکل باطل اور کبیر حقائق کے منافی ہے کہ تمام انسان کسی چیز کے اختراع پر متفق اور ہم خیال ہو جائیں۔ ان کی کثرتِ تعداد اور ان کا بعید از حد و شمار ہونا ہی ایسی متفق علیہ اختراع کے محال ہونے کے لیے کافی ہے۔ اب صرف دوسری صورت ہی ممکن ہے۔ یعنی اُن کا غیر معمولی اور ہمہ گیر اتفاق و اجماع سماعت کی بنا ہی پر ہو گا۔ یہی ثبوت ہے اس بات کا کہ خبر متواتر سے حاصل ہونے والا علم صحیح اور قطعی ہوتا ہے۔ اور اس کا سماعت پر مبنی ہونا ہی اُس کی صحت و قطعیت کے لیے ناقابلِ تردید حجت ہے۔

ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک احادیث متواترہ لاریب قابلِ حجت و استناد ہیں۔ کوئی ایسا واقعہ یا ایسا اثر نہیں ملتا جس سے یہ مترشح ہوتا ہو کہ امام صاحب نے کسی ایسی حدیث کو قبول کرنے سے انکار یا تامل کیا ہو جس کے تواتر کا انہیں علم ہو چکا تھا ـــ اور حقیقت یہ ہے کہ امام صاحب کے علم و تقویٰ سے یہ توقع بھی نہ تھی:

مشہور حدیث | مشہور حدیث وہ ہے جو طبقۂ اول یا طبقۂ دوم تک خبرِ واحد ہی رہی ہو یعنی اس کا سلسلۂ اسناد صرف چند راویوں تک محدود رہا ہو۔ مگر بعد میں شہرت پکڑ گئی ہو اور خبرِ متواتر کی طرح اس کے رُواۃ اس قدر کثیر التعداد ہو گئے ہوں کہ اُن کا تواتر علی الکذب یقین کے منافی ہو۔ کشف الاسرار کے مصنّف نے یہ شرط لگائی ہے کہ "شہرت کا اعتبار صرف قرن ثانی اور قرن ثالث تک ہوگا۔ تیسری صدی کے بعد کسی حدیث کا درجۂ شہرت تک پہنچنا معتبر نہیں ہوگا۔ بالعموم اخبارِ آحاد پہلے تین قرنوں کے اندر ہی شہرت کے رتبہ تک پہنچی ہیں۔ بعد میں جو حدیث شہرت حاصل کرے گی اُسے "مشہور" کی قسم میں شمار نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی اس سے اضافہ علی الکتاب جائز ہوگا یعنی ایسی غیر مشہور احادیث کو کتاب اللہ کے بعد دوسرا ماخذ شریعت نہیں قرار دیا جا سکے گا۔

مشہور یا مستفیض (مشہور حدیث کا دوسرا اصطلاحی نام) حدیث کی مندرجہ بالا تعریف اور شروط میں علماءِ حدیث اور علماءِ اصول دونوں متفق ہیں۔ البتہ مشہور حدیث کے حکم میں ان کے اندر اختلاف ہے۔ ایک فریق یہ کہتا ہے کہ مشہور حدیث اپنے حکم کے اعتبار سے اُسی درجہ کی ہے جس درجہ کی خبرِ واحد ہے۔ چنانچہ اس سے صرف ظن ہی کا فائدہ ہوگا اور اس پر عمل کر لینا ہی کافی ہوگا۔ مذہبِ حنفی کے علمائے تخریج میں سے ایک گروہ کی رائے یہ ہے کہ مشہور حدیث باعتبارِ حکم متواتر ہی کے ہم پلّہ ہے۔ اس سے علمِ یقینی حاصل ہوتا ہے مگر وہ یقین مشاہدۂ عینی سے حاصل ہونے والے یقین کے مرتبے کا نہیں ہوتا بلکہ استدلال اور برہان سے حاصل ہونے والا یقین ہوتا ہے۔ حنفی علماءِ مخرّجین کا دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ حدیثِ مشہور سے یقینی علم حاصل نہیں ہوتا بلکہ علمِ طمانیت (جس کی تعریف پیچھے گذر چکی ہے) حاصل ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک مشہور حدیث کا درجہ متواتر سے فروتر اور خبرِ واحد سے بالاتر ہے اور کتاب اللہ کے ساتھ اسے بھی مصدرِ تشریع قرار دیا جا سکتا ہے۔

حنفیہ متواتر کو قطعی حجت مانتے ہیں | ان اقوال و آراء سے یہ امر واضح ہو گیا کہ حنفیہ کے تمام گروہ بالاجماع حدیثِ مشہور کو مطلق اخبارِ آحاد سے فائق المرتبہ اور دین میں حجت اور سند تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے اندر اختلاف صرف اس پہلو میں ہے کہ حدیثِ مشہور علم یقین کی افادیت میں خبرِ متواتر کے ہم مرتبہ ہے یا اس سے کم تر ہے؟ اس کے ماخذِ استدلالِ احکام، مرجعِ شریعت اور قابلِ حجت ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ چنانچہ فقہ حنفی

میں متعدد ایسے شرعی احکام ملتے ہیں جن کا ماخذ احادیثِ مشہورہ ہیں۔ مثلاً حدِ رجم جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ثابت ہے کہ الثیب بالثیب جلد مائة ورجم بالحجارة[1]۔ ایک اور مشہور روایت میں مذکور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلۂ مازن کے ایک شخص ماعز پر رجم کی حد جاری فرمائی تھی۔ اسی طرح مسح علی الخفین (موزوں پر مسح کرنا) بھی آنحضور سے ایک مشہور روایت سے ثابت ہے۔ کفارۂ قسم کے روزوں کو پے در پے رکھنے کی شرط بھی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک مشہور روایت کی بنا پر لگائی ہے۔ انہی جزئیات مسائل پر غور و فکر کرکے فقہائے حنفیہ کو بالاتفاق یہ فیصلہ صادر کرنا پڑا کہ امام ابوحنیفہؒ حدیثِ مشہور کا مرتبہ علم یقین کے مساوی یا علم یقین کے قریب قریب قرار دیتے تھے اور اسے قرآن کے مطلق اور عام احکام کو مقید کرنے والی اور احکامِ شرعی کا مستقل ماخذ ٹھہراتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہائے حنفیہ کے درمیان حدیثِ مشہور کو افادیت یقین میں خبرِ متواتر کے مساوی درجہ دینے میں جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ صرف نظری حد تک محدود ہے۔ احکام فرعیہ کی عملی نوعیت میں اس اختلاف کا کچھ اثر مرتب نہیں ہوتا۔

(باقی آئندہ)

---

[1] یعنی شادی شدہ مرد و عورت اگر زنا کے مرتکب ہوں تو انہیں سو کوڑے بھی لگائے جائیں اور رجم کی سزا بھی دی جائے۔ یہ مسلم کی روایت ہے۔ محدثین کا ایک گروہ دونوں سزاؤں کو جمع کرنے کے حق میں ہے مگر حنفیہ کے نزدیک صرف حدِ رجم جاری ہوگی۔ حنفیہ اپنی اس رائے کی تائید میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ عمل پیش کرتے ہیں جس میں آنحضورؐ نے شادی شدہ زانی پر صرف حدِ رجم جاری فرمائی تھی۔ (مترجم)

رسائل و مسائل

قزع اور تشبّہ بالکفار

سوال۔ آپ نے رسائل و مسائل میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھا تھا کہ آپ کے نزدیک انگریزی طرز کے بال شرعاً ممنوع نہیں ہیں۔ آپ نے لکھا تھا کہ جو چیز ممنوع ہے وہ یا تو فعل قزع ہے یا وضع میں تشبہ بالکفار ہے اور انگریزی طرز کے بال ان دونوں کے تحت نہیں آتے۔ مگر آپ کا جواب بہت مختصر تھا اور اس میں آپ نے اپنے حق میں دلائل کی وضاحت نہیں کی، خصوصاً قزع کی جو تعریف آپ نے بتائی ہے اس کی تائید میں آپ نے کسی متعین حدیث یا اقوالِ صحابہ و ائمہ میں سے کسی قول کو نقل نہیں کیا۔ اسی طرح عہدِ نبوی میں غیر مسلموں کے اجزائے لباس کے اختیار کیے جانے کا آپ نے ذکر تو کیا ہے لیکن وہاں بھی آپ نے کوئی حوالہ پیش نہیں کیا۔ بہتر یہ ہوگا کہ آپ متعلقہ حوالہ جات کو بھی ترجمان میں نقل کر دیں تاکہ بات زیادہ صاف ہو جائے۔

آپ کی توضیح کے مطابق اس طرز کے بال رکھنا حرام تو نہیں لیکن آپ کا ذوق انہیں پسند بھی نہیں کرتا۔ کیا جو وضع اہلِ دین کے نزدیک ناپسندیدہ ہو مگر حرمت کے درجے میں نہ ہو اس کی روک تھام کے لیے کوئی عملی تدابیر اختیار نہیں کی جا سکتیں؟

جواب۔ کسی چیز کو شرعی حیثیت سے ناجائز کہنے کے لیے دو امور میں سے ایک کا پایا جانا ضروری ہے۔ یا تو بعینہ اس چیز کے متعلق کوئی حکم کلام شارع میں موجود ہو، یا شارع کی دی ہوئی کسی اصولی ہدایت کے تحت وہ ناجائز قرار پاتی ہو۔ اگر ان دونوں امور میں سے کوئی بھی نہ ہو تو ایسی چیز کو ناجائز نہیں کہا جا سکتا خواہ وہ کسی شخص یا گروہ کے مذاق پر کتنی ہی گراں ہو۔ اس قاعدۂ کلیہ کے تحت جب ہم تحقیق کرتے ہیں کہ انگریزی طرز کے بالوں کی شرعی حیثیت کیا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ مذکورۂ بالا وجوہِ تحریم میں سے کوئی

بھی یہاں نہیں پائی جاتی۔ سر کے بالوں کے متعلق نص صریح میں جس چیز کی ممانعت وارد ہوئی ہے وہ قزع ہے اور قزع کی جو تعریف ائمۂ حدیث و فقہ نے بیان کی ہے وہ یہ ہے:۔

ان یحلق بعض رأس الصبی و یترك بعض (نافع مولیٰ ابن عمر۔ صحیح مسلم)

یہ کہ بچے کے سر کا کچھ حصّہ مونڈا جائے اور کچھ حصہ چھوڑ دیا جائے۔

اذا حلق الصبی و ترك ھہنا شعرۃ و ھہنا و ھہنا و اشار الیٰ ناصیتہ و جانبی راسہ ... ولکن القزع ان یترك بناصیتہ شعر و لیس فی رأسہ غیرہ وکذالك شق راسہ ھذا و ھذا (عمر بن نافع۔ صحیح بخاری)

جبکہ بچے کا سر اس طرح مونڈا جائے کہ صرف پیشانی پر اور سر کے دونوں جانب بال چھوڑ دیئے جائیں (پھر دوبارہ پوچھنے پر مزید تشریح کی کہ) مگر قزع یہ ہے کہ پیشانی کے بال چھوڑ کر باقی سارا سر مونڈ دیا جائے، اور اسی طرح یہ کہ سر کے اِن اِن حصوں کو چھوڑ کر باقی سر مونڈ ڈالا جائے۔

ابوداؤد کی روایت میں یہ تشریح خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے مستنبط ہوتی ہے۔ اس میں ابن عمر فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بچے کو دیکھا جس کے سر کا کچھ حصہ مُنڈا ہوا تھا اور کچھ حصے پر بال چھوڑ دیئے گئے تھے۔ حضور نے اس فعل سے منع کیا اور فرمایا احلقوا کلہ او اترکوا کلہ "یا تو پورا مونڈ دو یا پورے سر کے بال چھوڑ دو" اس سے یہ بات متعین ہوگئی کہ شریعت میں جو چیز لعینہٖ ممنوع ہے وہ کچھ مونڈنا اور کچھ رکھنا ہے، اور ظاہر ہے کہ اس کا اطلاق ان بالوں پر نہیں ہوتا جو آج کل انگریزی بال کے نام سے مشہور ہیں۔

اب رہ گیا دوسرا امر کہ شارع کی کسی اصولی ہدایت کے تحت ان بالوں کو ناجائز قرار دیا جائے، تو وہ اصولی ہدایت صرف نہی تشبہ والی ہدایت ہو سکتی ہے جس کے اس معاملہ پر منطبق ہونے کا دعویٰ کرنا ممکن ہے۔ لیکن اس معاملہ میں تحقیق طلب امر یہ ہے کہ تشبّہ سے مراد کیا ہے؟ آیا تشبہ مجموعی وضع و ہیئت ہی میں ہوتا ہے یا جزئی طور پر بھی ہو سکتا ہے؟ اس سوال کی تحقیق میں جب حدیث پر نگاہ ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جزئی طور پر غیر مسلم قوموں کی کوئی چیز لے کر اپنی وضع و معاشرت

میں شامل کر لینے کو ناجائز نہیں سمجھتے تھے۔ مثال کے طور پر شلوار ایران کی چیز تھی جو عرب پہنچکر سراویل کے نام سے موسوم ہوئی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے استعمال کو نہ صرف جائز رکھا بلکہ خود بھی استعمال فرمایا۔ چنانچہ بخاری میں ابن عباس کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا من لم یجد ازاراً فلیلبس سراویل (جس کو تہمت نہ ملے وہ شلوار پہن لے) اور معتبر روایات سے ثابت ہے کہ حضورؐ نے شلوار خود بھی خریدی تھی اور آپ کے زمانے میں آپ کی اجازت سے مسلمان بھی اس کو پہنتے تھے[1]۔ اسی طرح برنس کے استعمال کو آپ نے نہ صرف جائز رکھا تھا بلکہ ایک صحابی کو خود تحفۃً دی تھی اور قرنِ اول کے قراء میں اس کا استعمال عام تھا حالانکہ یہ عیسائی راہبوں کی ٹوپی تھی۔ اسی بنا پر سلف میں سے بعض حضرات نے اس کے استعمال کو مکروہ بھی سمجھا تھا لیکن امام مالکؒ نے ان کے اس خیال کی صاف صاف تردید فرمائی[2]۔ اسی طرح حضورؐ نے مختلف اوقات میں ایسے جبے بھی استعمال فرمائے ہیں جو غیر مسلم قوموں سے درآمد ہوئے تھے، چنانچہ معتبر احادیث سے آپ کا جبۂ شامیہ، جبۂ رومیہ اور جبۂ کسروانیہ پہننا ثابت ہوتا ہے، حالانکہ جبۂ شامیہ یہودیوں کے لباس کا جزء تھا، جبۂ رومیہ رومن کیتھولک عیسائیوں کا لباس تھا اور جبۂ کسروانیہ ایرانی فیشن کی چیز تھی۔ ان تمام روایات سے یہ بات ناقابلِ انکار طور پر ثابت ہوتی ہے کہ غیر مسلم قوموں کے تمدن، معاشرت اور وضع و ہیئت میں سے متفرق اجزاء لے کر (بشرطیکہ ان میں سے کوئی چیز بذاتِ خود حرام نہ ہو) اپنی معاشرت میں داخل کر لینا تشبّہ نہیں ہے، بلکہ تشبّہ کا اطلاق صرف اس چیز پر ہو سکتا ہے کہ کوئی مسلمان اپنے آپ کو بحیثیتِ مجموعی کسی غیر مسلم قوم کی وضع و ہیئت میں ڈھال لے، حتیٰ کہ اسے دیکھ کر ایک ناواقف آدمی یہ نہ سمجھ سکے کہ یہ مسلمان ہے۔ اب یہ صاف ظاہر ہے کہ جو شخص اپنی مجموعی وضع مسلمانوں کی سی معروف وضع رکھتا ہو اور اس میں صرف انگریزی بال اس کے سر پر ہوں تو اسے تشبّہ کا الزام نہیں دیا جا سکتا۔

بلاشبہ میرے اپنے مذاق پر بھی اب یہ بال گراں ہیں اور اسی لیے میں نے ان کو چھوڑ دیا ہے، لیکن یہ

---

[1] فتح الباری، کتاب اللباس، باب السراویل۔ زاد المعاد فصل فی ذکر سراویلہ ونعلہ وغیر ذالک

[2] فتح الباری، کتاب اللباس، باب البرانس

بلکہ خوب ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ حدود حلال و حرام اور چیز ہیں، اور وہ مذاق اور چیز ہے جو اسلامی ذہنیت کے نشو و نما سے ابھرتا ہے۔ ان دونوں چیزوں کو خلط ملط نہیں کیا جا سکتا۔ ہم ایک اسلامی نظام میں جس چیز کو ضابطہ کے طور پر حکماً نافذ کر سکتے ہیں وہ صرف حدودِ حلال و حرام ہیں۔ رہا وہ مذاق جو اسلامی ذہنیت کے ارتقاء سے ہم میں پیدا ہوتا ہے، تو اول تو ضروری نہیں ہے کہ وہ تمام اہلِ ایمان میں متفق علیہ ہو، دوسرے اگر وہ متفق علیہ بھی ہو تب بھی ہمیں اس کو "شریعت" قرار دینے کا حق نہیں ہے۔ شریعت تو صرف ان احکام کا نام ہے جو کتاب و سنت میں منصوص ہوں۔ منصوصات سے ماورا جو اجتہادی یا ذوقی امور ہوں ان کو رائج کرنے کے لیے استدلال، تعلیم، تربیت وغیرہ کے ذرائع استعمال کیے جا سکتے ہیں مگر ان کا حکم نہیں دیا جا سکتا۔

خواب میں زیارتِ نبویؐ

سوال- براہ کرم مندرجہ ذیل سوال کے بارے میں اپنی تحقیق تحریر فرما کر تشفی فرمائیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ جس نے مجھے خواب میں دیکھا تو درحقیقت اس نے مجھے ہی دیکھا۔ کیونکہ شیطان میری تمثیل میں نہیں آسکتا۔ او کما قال۔

اس حدیث کی صحیح تشریح کیا ہے؟ کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جس شکل و شباہت میں بھی خواب میں دیکھا جائے تو یہ حضورؐ ہی کو خواب میں دیکھنا سمجھا جائیگا؟ کیا حضورؐ کو یورپین لباس میں دیکھنا بھی آپ ہی کو دیکھنا سمجھا جائے گا؟ اور کیا اس خواب کے زندگی پر کچھ اثرات بھی پڑتے ہیں؟

جواب- اس حدیث کا صحیح مطلب یہ ہے کہ جس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حضورؐ کی اصلی صورت میں دیکھا اس نے درحقیقت آپ ہی کو دیکھا، کیونکہ شیطان کو یہ قدرت نہیں دی گئی ہے کہ وہ آپ کی صورت میں آکر کسی کو بہکا سکے۔ اس کی یہی تشریح حضرت محمد بن سیرین رحمۃ اللہ نے کی ہے۔ امام بخاری کتاب التعبیر میں ان کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ اذا راہ فی صورتہ (جبکہ دیکھنے والے نے آپ کو آپ ہی کی صورت

میں دیکھا ہو)۔ علامہ ابن حجر صحیح سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ جب کوئی شخص ابن سیرین سے کہتا کہ میں نے خواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے تو وہ اس سے پوچھتے تھے کہ تو نے کس شکل میں دیکھا۔ اگر وہ آپ کی کوئی ایسی شکل بیان کرتا جو آپ کے حلیے سے نہ ملتی تھی تو ابن سیرین کہہ دیتے تھے کہ تو نے حضور کو نہیں دیکھا ہے۔ یہی طرز عمل حضرت ابن عباس کا بھی تھا جیسا کہ حاکم نے بسند نقل کیا ہے۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ خود حدیث کے الفاظ بھی اسی معنی کی توثیق کرتے ہیں جن مختلف الفاظ میں یہ حدیث صحیح سندوں سے منقول ہوئی ہے ان سب کا مفہوم یہی ہے کہ "شیطان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں نہیں آسکتا" نہ یہ کہ شیطان کسی شکل میں آکر آدمی کو یہ دھوکہ نہیں دے سکتا کہ وہ آنحضور کو دیکھ رہا ہے۔

اس کے ساتھ یہ بات بھی جان لینی ضروری ہے کہ اگر کوئی شخص خواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھے اور آپ سے کوئی امر یا کوئی نہی کا حکم سنے، یا دین کے معاملے میں کسی قسم کا ایماء آپ سے پائے تو اس کے لیے اس خواب کی پیروی اس وقت تک جائز نہیں ہے جب تک وہ اس تعلیم یا ایماء کے مطابق کتاب و سنت ہونے کا اطمینان نہ کرے۔ اللہ اور اس کے رسول نے ہمارے لیے دین کا معاملہ خوابوں اور کشفوں اور الہاموں پر نہیں چھوڑا ہے۔ حق اور باطل اور صحیح اور غلط کو ایک روشن کتاب اور ایک مستند سنت میں پیش کر دیا گیا ہے جسے بیداری میں اور پورے شعور کی حالت میں دیکھ کر راہ راست معلوم کی جاسکتی ہے۔ اگر کوئی خواب یا کشف یا الہام اس کتاب اور اس سنت کے مطابق ہے تو خدا کا شکر ادا کیجیے کہ اللہ نے حضور کی زیارت نصیب کی، یا کشف و الہام کی نعمت سے نوازا لیکن اگر وہ اس کے خلاف ہے تو اسے رد کر دیجیے اور اللہ سے دعا مانگیے کہ وہ ایسی آزمائشوں سے آپ کو اپنی پناہ میں رکھے۔

ان دو باتوں کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بکثرت لوگ گمراہ ہوئے ہیں اور ہوتے ہیں۔ متعدد آدمی میرے علم میں ایسے ہیں جو صرف اس بنا پر ایک گمراہ مذہب کے پیرو ہو گئے کہ انہوں نے خواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس مذہب کے بانی کی توثیق کرتے یا اس کی طرف التفات فرماتے دیکھا تھا۔ وہ اس گمراہی میں نہ پڑتے اگر اس حقیقت سے واقف ہوتے کہ خواب میں کسی شکل کے انسان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے دیکھ لینا درحقیقت حضور کو دیکھنا نہیں ہے، اور یہ کہ خواب میں واقعی حضور ہی کی زیارت نصیب ہو تب

بھی کوئی حکم شرعی اور امر دینی ایسے خواب سے اخذ نہیں کیا جا سکتا۔

بعض لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر شیطان کے فریب سے تحفظ صرف اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ آدمی حضور کو آپ کی اصلی شکل میں دیکھے تو اس کا فائدہ صرف انہی لوگوں کو حاصل ہو سکتا تھا جنہوں نے آپ کو بیداری میں دیکھا۔ بعد کے لوگ آخر کیسے جان سکتے ہیں کہ جو شکل وہ خواب میں دیکھ رہے ہیں وہ حضور ہی کی ہے یا کسی اور کی؟ ان کو اس حدیث سے کیا تسلی حاصل ہوئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بعد کے لوگ اس بات کا اطمینان تو نہیں کر سکتے کہ انہوں نے جو شکل خواب میں دیکھی وہ حضور ہی کی شکل تھی، مگر یہ تو معلوم کر سکتے ہیں کہ خواب کے معنی اور مضمون کی مطابقت قرآن و سنت کی تعلیم سے ہے یا نہیں۔ مطابقت پائی جاتی ہو تو پھر زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ انہوں نے خواب میں حضور ہی کی زیارت کی ہے، کیونکہ شیطان کسی کو راہ راست دکھانے کے لیے تو بہروپ نہیں بھرا کرتا۔

گول مول جوابات

سوال۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ ہمیشہ ہر مسئلہ کا گول مول جواب دیتے ہیں۔ اور اگر مزید وضاحت چاہی جائے تو آپ بگڑ جاتے ہیں یا پھر جواب سے بے بس ہو کر انکار کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میں خود ایسے انسانوں کا ہم خیال نہیں ہوں، کیونکہ جہاں تک میں جانتا ہوں آپ ہمیشہ مسئلہ کو دو ٹوک اور وضاحت سے سمجھاتے ہیں۔ خدا کرے میرا یہ حسن ظن قائم رہے۔

گزارشات بالا کا لحاظ رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات دیجیے۔

(۱) کوئی تارکِ سنت بزرگ ولی ہو سکتا ہے یا نہیں؟

(۲) حضرت رابعہ بصری نے کیوں سنتِ نکاح کو ترک کیا تھا؟

(۳) حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوبِ الٰہی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے پیر و مرشد حضرت خواجہ سید بابا فریدالدین گنج شکرؒ کے ایک باطنی اشارہ پر تا عمر شادی نہ کی تھی۔ آپ

کے نزدیک پیر و مرشد کا خلافِ سنت اشارہ کرنا اور مرید کا باوجود استطاعت کے سنتِ نکاح کو ترک کرنا کس حد تک درست ہے؟

جواب:- میں معقول اور ضروری سوالات کا جواب تو ہمیشہ وضاحت کے ساتھ دینے کی کوشش کرتا ہوں مگر بیکار اور غیر ضروری سوالات کے معاملہ میں پیچھا چھڑانے کے سوا مجھے اور کوئی صحیح طریقہ معلوم نہیں ہے۔ اب آپ خود اپنے سوالات پر غور کیجیے۔ اگر آپ صرف پہلے سوال پر اکتفا کرتے تو میں بآسانی یہ جواب دے سکتا تھا کہ تارکِ سنت ولی نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ تیسرے سوال کا صرف آخری حصہ پوچھتے تو اس کا بھی یہ جواب دیا جا سکتا تھا کہ کسی کے مشورے یا حکم سے ترکِ سنت جائز نہیں ہے۔ مگر آپ اس سے آگے بڑھ کر دو مرحوم بزرگوں کا مقدمہ بھی پیش کر دیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ میں ان کے مقدمے کا فیصلہ سناؤں۔ آپ بتائیے کہ آپ کا خود اس بحث میں پڑنا اور پھر مجھے بھی اس میں الجھانے کی کوشش کرنا کہاں تک صحیح ہے؟ میرے یا آپ کے پاس یہ جاننے کا کیا ذریعہ ہے کہ حضرت رابعہ بصریہ نے اس قدر متبع سنت ہونے کے باوجود کیوں شادی نہ کی؟ اور حضرت نظام الدین کو ان کے شیخ نے کن مخصوص حالات یا اسباب کی بنا پر یہ مشورہ دیا اور دیا بھی یا کہ نہیں دیا؟ سارے حالات نہ میرے سامنے ہیں نہ آپ کے سامنے۔ اگر میں حالات سے واقفیت کے بغیر ان بزرگوں پر کوئی حکم لگاؤں تو زیادتی کروں گا۔ اگر ان کے فعل کی تاویل کروں تو دوسرے لوگوں کے لیے بھی ترکِ سنت کی ترغیب کا ذریعہ ہوں گا۔ اور پھر نفسِ مسئلہ کو سمجھنے کے لیے اس کی کوئی حاجت بھی نہیں ہے کہ آج میں یا آپ پچھلے بزرگوں کے معاملات کا فیصلہ کریں۔ آپ خود مجھے بتائیے کہ اس طرح کے سوالات سے اگر میں پیچھا چھڑانے کی کوشش نہ کروں تو کیا کروں؟ اسی طرح کے سوالات و جوابات کے بارے میں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے کہ فَلَا تُمَارِ فِيهِمْ إِلَّا مِرَاءً ظَاهِرًا وَلَا تَسْتَفْتِ فِيهِم مِّنْهُمْ أَحَدًا (ان کے معاملے میں صرف سرسری بحث کیجیے اور ان سے متعلق اُن میں سے کسی سے پوچھ گچھ نہ کیجیے۔ الکہف)

مطبوعات

دستورِ پاکستان | از جناب مولانا غلام محمد صاحب ترنم۔ ناشر: محمد سکندر ذوالقرنین، مکتبۂ علامہ ترنم ۱۱۔ اسلامیات پارک، بیڈن روڈ۔ لاہور۔ قیمت نامعلوم۔

اچھے کاغذ پر خوبصورت ٹائپ میں چھپا ہوا یہ پمفلٹ بھی اسلامی دستور کے اصولیات سامنے لاتا ہے۔ کوتاہی بس اتنی ہے کہ سوچنے کا انداز اور تحریر کا مزاج مولویانہ ہے۔

الجامعہ ـــ دستور نمبر | بہ ادارت جناب صادق جامعی۔ مقام اشاعت: جامعہ محمدی شریف، ضلع جھنگ۔ چندہ سالانہ پانچ روپے۔ قیمت دستور نمبر ۱۲؍

دسمبر و جنوری ۵۶ء کے اس مشترک شمارے میں دستور کے بارے میں اسلامی اصولیات کو نمایاں کرنے والے چند مقالات، مفکر، غلام احمد حریری، ڈاکٹر حمید اللہ، مولانا احمد علی صاحب، قاضی عبد الغنی اور محمد کرم شاہ الازہری کے قلم سے جمع کیے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک مضمون انگریزی میں، ایک عربی میں اور بقیہ اردو زبان میں ہیں۔ موضوع سے متعلق قائداعظم کے نام علامہ اقبال کا ایک تاریخی خط بھی شائع کیا گیا ہے۔

حکومتِ ربانی | از جناب ذاکر حسین صاحب فاروقی بی اے، مدیر روزنامہ انقلاب بمبئی۔ شائع کردہ: ادارۂ معارفِ اسلام (رجسٹرڈ) لاہور۔ قیمت ۸؍

یہ شیعی نقطۂ نظر سے لکھا ہوا مضمون ہے۔ اس میں ادعا یہ کیا گیا ہے کہ خالص الٰہی نظامِ حکومت وہی ہو سکتا ہے جس میں نظریۂ امامت کے مطابق حکمران خدا تعالیٰ کا نامزد کردہ ہو۔ بخلاف اس کے ملتِ اسلامیہ (اہل سنت) میں سقیفہ بنو ساعدہ سے جو نظامِ حکومت خلافت و جمہوریت کے عنوان سے چلا وہ اپنی فطرت کے لحاظ سے انسانی حاکمیت پر مبنی تھا اور اسی وجہ سے چند ہی برس میں اس نے بادشاہت کی شکل اختیار کر لی۔ افسوس ہے کہ اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا گیا کہ آج جبکہ خدا کا نامزد کردہ امام مہدی غائب ہے تو اس دوران میں نظریۂ امامت کے تحت کیا مسلمانوں کو بغیر کسی حکمران کے رہنا چاہیے اور اگر حکمران

ہونا چاہئے تو اس کا تقرر کس ذریعے سے ہونا چاہیے۔ مضمون زیادہ تر دوسروں کی تردید کے لیے وقف ہے تعمیری اور مثبت پہلو سے جو نظریہ دیا گیا ہے وہ مجمل اور مبہم ہے اور اس پر کسی نظام حیات کی استواری کا تصور نہیں کیا جا سکتا، اس کے بل پر تو بس مناظرے لڑے جا سکتے ہیں۔

INTERESTLESS BANKING تالیف: پروفیسر محمد عُزیر، ایم اے۔ شائع کردہ: ریحان پبلیکیشنز، کراچی و ڈھاکہ

"اسلامی نظام" کا تصور جب سے فروغ پا رہا ہے تمدنی زندگی کے تمام بڑے بڑے مسائل زیر بحث آ رہے ہیں۔ ایک قابلِ بحث مسئلہ سود اور نظامِ بنک کاری کا ہے۔ یہ امر قطعی ہے کہ سود ہمارے ہاں حرام ہے اور مسلم سوسائٹی میں اسے جاری نہیں رہنا چاہیے۔ لیکن ہماری اقتصادی سرگرمیوں کا دار و مدار آج جس نظام بنک کاری پر ہے اس کی ریڑھ کی ہڈی اصولِ ربو ہے۔ سود کو حرام کیجیے تو بنک کاری کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے اور بنک کاری کو جاری رکھیے تو سود کو حلال ٹھہرانا پڑتا ہے۔ مگر دو برائیوں میں سے ایک کو قبول کرنے کے بجائے تیسرا راستہ بھی نکالا جا سکتا ہے۔ یعنی سرے سے نظامِ بنک کاری کو بدل دیا جائے اور اسے اسلامی اصول و حدود کا پابند بنا دیا جائے۔ پیشِ نظر انگریزی پمفلٹ کا موضوع بحث یہی ہے۔ سود کے بجائے اسلام کے اصولِ مضاربت (حصہ داری نفع و نقصان) کو سامنے رکھ کر فاضل پروفیسر نے بڑی خوبی سے ایک نئے نظامِ بنک کاری کا تصور دلایا ہے۔ سلسلۂ بحث میں اس موضوع سے متعلق تین ناگزیر مسائل لیے گئے ہیں: ایک یہ کہ "عفو" (SAVINGS) اور سرمایہ کاری (INVESTMENT) کے درمیان عملاً شرح سود (RATE OF INTEREST) واحد ذریعہ انضباط ہے، اب اگر سود کو اڑا دیا جائے تو اس کی جگہ دوسرا ذریعۂ انضباط کیا ہو گا؟ دوسرے یہ کہ بنک اپنے سرمایہ کا وافر حصہ قلیل المیعاد (SHORT TERM) عاریت میں دیتا ہے اور اس صورت میں حصہ داری نفع و نقصان کا اصول نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا، پھر ایک اسلامی بنک اس دائرے میں کیا تدبیر اختیار کر سکے گا؟ تیسرے یہ کہ غیر ممالک سے تجارتی معاملات کس طرح چلیں گے جبکہ ان سب کا نظامِ بنک کاری و مبادلہ سرمایہ دارانہ اصول ربو پر چل رہا ہے؟ اگرچہ ایک محدود سے مقالے میں ایسی پیچیدہ بحثوں کو فیصلہ کن حد تک نہیں پہنچایا جا سکتا، لیکن پھر بھی مؤلف کا اجتہادی طرزِ فکر قارئین پر سوچنے کی نئی راہیں کھول دیتا ہے۔ ہم مؤلف کے قلم سے اس موضوع پر ایک جامع تحقیقی کتاب کے منتظر رہیں گے۔

خـــالی صفحـــه